39
لیلورا
Re. 1
COPY
اکرم الہ آبادی
اسپیشل ناول

جاسوسی دائرہ سیریز

# ایلورا

اکرم الہ آبادی

Akram Allahabadi

فرحت پبلیکیشنز۔ممبئی۔انڈیا

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

اس ناول میں شائع ہونے والے تمام واقعات،
مقامات و کردار فرضی ہیں۔اس سے کسی طرح
کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔جس کی مصنف،
پبلشر و پرنٹر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اس ناول کی دوبارہ اشاعت، ترجمے یا کسی اور مقصد سے استعمال کے
لئے پبلشر کی تحریری اجازت ضروری ہے ورنہ قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

پرنٹر:۔۔۔۔۔ممبئی۔انڈیا

Akram Allahabadi

# انتساب

میسرز قمرالدین بدرالدین اورفیری انڈسٹریز بمبئی جیسی فرموں کے مالک
اوراپنے بڑے پرخلوص بھائی بدرالدین ایسد لال کے نام ۔۔۔۔۔جواپنے گھوڑے ''سلمان''
کوبھی اپنی اولادوں میں شامل سمجھتے ہیں اورسلمان نے بھی پونہ کی ایک ریس جیت کر یہ حق
برخورداریت ادا کردیا ہے۔

Akram Allahabadi

# دُھن اپنی اپنی

اس نے تقریباً بارہ انچ لمبے گرگٹ کو دم پکڑ کر لٹکا رکھا تھا۔

لیکن وہ کوئی مداری یا شعبدہ باز نہیں، بلکہ اکیڈمی آف سائنٹفک اینڈ کلچرل ریسرچ کے شعبۂ علم الابدان کا انچارج ڈاکٹر دوبے تھا۔ان دنوں وہ پرانی نسل کے گرگٹوں کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔زمانۂ ماقبل از تاریخ کے کوہ پیکر عفریتوں (Dinosaur) کے چند ڈھانچے جب سے امریکہ کے محکمۂ علم الابدان میں مختلف کوششوں سے حاصل کیے ہوئے ہڈیوں کے ٹکڑوں کو جوڑ کر مکمل کیے گئے تھے، تب سے ڈاکٹر کو یہ خبط سما گیا تھا کہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں اب بھی ایسے بہت پرانی نسل کے گرگٹ موجود ہیں جو اپنی کئی ہزارویں پشت میں دینو ساری عفریتوں کے ایک قسم (Reptiles) کی اولاد ہیں اور اس سے پہلے ڈاکٹر کو ایک زُو (چڑیا گھر) میں شترمرغ کو دیکھتے دیکھتے اچانک یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ حاتم طائی کے قصوں میں جس دیو پیکر پرندے 'رُخ' کا ذکر کیا گیا ہے، ممکن ہے وہ زمانہ قدیم میں ایک حقیقی وجود رہا ہو اور پھر اس کی نسلیں تبدیل ہوتے ہوتے شترمرغ کی شکل اختیار کر گئیں۔اس جھک کے سوار ہوتے ہی ڈاکٹر نے قصد کر لیا تھا کہ وہ افریقہ جائے گا تاکہ اپنے اسی نقطۂ نظر پر باقاعدہ تحقیق کر سکے، مگر اکیڈمی کا پرنسپل ڈائرکٹر زیادہ عقلمند آدمی تھا۔اس نے ڈاکٹر کو اس کے لیے اجازت نہیں دی۔ جس کے نتیجے میں ڈاکٹر گرگٹوں کے پیچھے پڑ گیا۔وہ تقریباً ۶۰ سال کا تندرست بوڑھا تھا اور صحت اتنی اچھی تھی کہ نہ کمر نے جھکنے کا نام لیا تھا، نہ دانتوں نے پنشن طلب کی تھی۔لیکن اپنے کام میں اس کا انہماک پاگل پن کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ وہ اپنے تلاش کردہ جانوروں سے ہی ان کے آبا و اجداد کے بارے میں یک طرفہ بحث کرنے لگتا اور جب وہ بیچارے کچھ جواب نہ دے پاتے تو اس خاموشی نیم رضا کے مصداق اپنے نظریات کو خود صحیح قرار

دے کر وہ اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا کرتا۔اس کے نوٹس بھی عجیب طرح کے ہوتے۔مثلاً سانڈے ہرگز اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ زمانہ ما قبل تاریخ کے ڈیمٹر ڈون (Diematrodon) کی نسل سے نہیں ہیں۔یا آسٹریلوی کنگارو کو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ وہ دینوساری دور کی ٹراچوڈون مائرابلیز (Trachodon Morabilsis) کی نسل کا سکڑا ہوا چربہ ہے۔اس کی ڈائری اسی کے پاس محفوظ رہتی،لیکن کبھی کبھی جب ڈاکٹر کی لڑکی کرن کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا۔وہ اس دن ڈاکٹر کو بہت پریشان کرتی اور ڈاکٹر یہی کہتا رہتا کہ تم گدھی ہو،تم کیا سمجھو گی ان چیزوں کو۔

اور اس جواب کے ساتھ وہ جب حشراتیات سے متعلق کوئی لیکچر شروع کر دیتا تو وہ بور ہو کر کسی نہ کسی بہانے وہاں سے بھاگ جاتی اور ڈاکٹر کو اپنی لڑکی سمیت دنیا بڑی بیوقوف نظر آنے لگتی۔

گھر کے علاوہ اکیڈمی میں بھی وہ اپنی دھن میں اس قدر کھویا رہتا کہ کبھی کبھی تو پاس سے گزرتے ہوئے آدمی کے سلام کا جواب دینے کے باوجود اسے یہ نہ معلوم ہوتا کہ کون سامنے سے گزر رہا ہے۔

اکیڈمی میں ایسی ہی دو شخصیتیں تھیں۔ایک ڈاکٹر دوبے کی اور دوسری شعبۂ آثار کے انچارج ڈاکٹر مدن کی۔ڈاکٹر دوبے کے برعکس ڈاکٹر مدن ۳۸،۴۰ سال کا جوان آدمی تھا۔جوان اس لیے کہ اس کے چہرے پر ابھی تک جوانی کی تازگی اور صحت میں نکھار تھا۔کھلے ہوئے رنگ کا خوبصورت سا آدمی۔البتہ شاید نزلے کے اثر سے اس کے سر کے بالوں کے درمیان کے کچھ بال سفید ہو گئے تھے اور اس نے انھیں خضاب سے کالے کر ڈالنے کی ضرورت کبھی نہیں سمجھی۔تصنع وہ وہ ہمیشہ نفرت کرتا تھا۔محکمۂ آثار میں اس کی ذات مجمع الآثار تھی۔کسی بھی دور کی تہذیب اور اس کی تاریخ کے متعلق معلومات اس سے حاصل کی جا سکتی تھیں۔حتیٰ کہ اسے قدیم عبرانی، رومی، چینی اور پتھر کے دور کی اس زبان سے بھی واقفیت حاصل تھی جو ہتھیاروں اور

دوسری چیزوں کی تصویروں کے ذریعے پتھر پر نقش کی جاتی تھی۔اسے زندگی میں صرف دو کاموں سے ہی گہری دلچسپی تھی،ایک آثار قدیمہ دوسرا سنگ تراشی ومجسمہ سازی۔دوسرا کام اس کا اپنا شوقیہ مشغلہ تھا جس کے بارے میں ان لوگوں کو علم تھا جو اس کے گھر جا چکے تھے،یا جو اس کے بڑے سے ہال کو دیکھ چکے تھے،جس میں علیٰحدہ علیٰحدہ چبوتروں پر خود ڈاکٹر مدن کے تراشے ہوئے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔مختلف نسلوں اور ادوار کے انسانوں کے مختلف الاقسام تاریخی آثار کے۔اور مختلف زمانوں کی مختلف اقوام میں پوجے جانے والے دیوی دیوتاؤں کے۔

اس نے رومنوں کی شکار کی دیوی ڈیانا (Diana) اور حسن کی دیوی وینس (Venis) کے بہت خوبصورت مجسمے بھی اپنے ہاتھوں سے سنگِ مرمر کے ٹکڑوں پر تراش کر اسٹڈی کے اس سامنے والے بڑے چبوترے کی سیڑھیوں پر کھڑے کیے تھے جو پچھلی دیوار میں تقریباً دو فٹ تک اندر دبی ہوئی ایک محراب کے نیچے بنا ہوا تھا۔

وہ اتنا اچھا فنکار تھا کہ اگر اپنے ان مجسموں کو کسی نمائش یا بازار میں لے آتا تو بلاشبہ اسے اس دور کا بہترین سنگ تراش (Sculptur) تسلیم کیا جاتا۔مگر وہ اپنے اس شوق کو صرف اپنی ذات کی حد تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔اس لیے بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ مجسمہ ساز بھی ہے۔اس کی زندگی بس ان ہی دو دلچسپیوں سے وابستہ تھی۔ماں باپ کا سایہ تو مدت ہوئی سر سے اٹھ گیا تھا۔صرف ایک بہن تھی جو دہلی میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ڈاکٹر مدن اپنے بڑے گھر میں اکیلا ہی صرف دو نوکروں کے ساتھ رہتا تھا۔

ڈاکٹر مدن اور ڈاکٹر دوبے دونوں ہی اپنی اپنی دھن میں کچھ اس درجہ کھوئے رہتے کہ کبھی کبھی تو ایک ہی اکیڈمی میں ہوتے ہوئے کئی کئی ہفتوں تک ان کی ملاقات نہ ہوتی۔حالانکہ روز ہی وہ اکیڈمی میں آیا کرتے تھے اور بارہا ایک دوسرے کے سامنے سے گزرتے تھے،مگر اس طرح جیسے خود انے سے بے خبر ہوں۔آج بھی یہی ہوا ہوتا اگر ڈاکٹر دوبے خود موڈ میں آکر ڈاکٹر مدن کے آفس میں نہ پہنچ گیا ہوتا۔

Akram Allahabadi

ڈاکٹر مدن اس وقت ٹیبل لیمپ کی روشنی میں میز پر جھکا ہوا ایک سیاہ رنگ کے پتھر کے ٹکڑے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور میز کے قریب ہی اس کا اسسٹنٹ سعید مرزا کھڑا تھا۔ پتھر کے اس ٹکڑے پر کچھ ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھدی ہوئی تھیں، جنھیں وہ اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے بہت خاص یا عجیب چیز ہوں۔ ڈاکٹر دوبے کے قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔ وہ اپنی مصروفیت کے وقت کسی بھی شور یا مداخلت سے جھنجلا جایا کرتا تھا، مگر ڈاکٹر دوبلے کا حلیہ دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ ڈاکٹر کا عجیب عالم تھا۔ چہرے پر کچھ اس طرح کی پرمسرت سرخی جھلک رہی تھی جیسے کوئی قلعہ فتح کر کے آرہے ہوں اور گردن میں ڈھیلی ٹائی، سر کے بکھرے ہوئے بال اور ناک پر ایک طرف جھکی ہوئی عینک بتا رہی تھی کہ مشغولیت بے پناہ رہی ہے۔

''ہیلو ڈاکٹر۔'' مدن خود ہی ان سے مخاطب ہو گیا۔ ''آج پھر کیا کوئی ہاتھی پکڑ لائے ہو؟''

''ہاتھی؟'' ڈاکٹر دوبے نے چونک کر پوچھا۔

''میں تو تمہارے ان گرگٹوں کو بھی ہاتھی ہی سمجھتا ہوں۔ دینو سار کی نسل سے ہیں نا۔'' ڈاکٹر مدن انھیں کریس پیش کرتے ہوئے مسکرایا۔

''ہاں ہاں، اس میں کیا شک ہے۔'' ڈاکٹر دوبے نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ سعید مرزا سے مخاطب ہو گئے۔ ''ذرا میرے آفس سے پانڈے کو بلا دیجیے۔ کہیے گا خالی مرتبان لیتا آئے۔''

''بہت اچھا۔'' سعید مرزا یہ کہہ کر چلا گیا۔ اور ڈاکٹر مدن ڈاکٹر کے اس گرگٹ کو غور سے دیکھنے لگا جسے دم پکڑ کر ڈاکٹر دوبے نے لٹکا رکھا تھا۔

''کیا سمجھتے ہو؟ یہ دینو سار دور سے بھی پرانے رینگنے والے وسٹیگو سار کی نسل کا ہے۔ مگر میں سوچ رہا ہوں کہ وہ جانور اب سے تقریباً بیس لاکھ سال پہلے شمالی امریکہ میں پایا جاتا تھا۔ پھر اس کی ذریات ہندوستان میں کیسے آ گئیں؟''

Akram Allahabadi

''ظاہر ہے کہ پیدل چل کر تو آئی نہ ہو گی۔''

''تم مذاق کر رہے ہو، حالانکہ میں قطعی سنجیدہ ہوں۔''

''اچھا چلیے مان کہا کہ یہ بیس لاکھ برس پرانے رینگنے والا عفریت کی اولاد ہے تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق...؟'' ڈاکٹر نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''اور یہ جو تم پرانے آثار تلاش کرتے پھرے ہو، ان سے کوئی لڈو مل جاتے ہیں؟''

''کم از کم قدیم تہذیب اور ان دنوں کے ماحول سے تو وقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ہم ارتقائے نسلِ انسانی کا صحیح اندازہ ماضی کے مطالعے سے ہی قائم کر سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''اور اس مطالعے سے کیا کوئی محل تعمیر کر لو گے؟''

''یوں ہی سمجھ لو۔ یہ مطالعہ ہی ہے جس نے انسان کو آج اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچان سکے۔''

''یہ کام تو آئینہ بھی کر سکتا ہے۔''

''تو پھر کیا آپ اپنے گرگٹوں سے دنیا کی تاریخ مرتب کریں گے؟'' ڈاکٹر مدن جھنجلا گیا۔

''مائی ڈیئر ڈاکٹر، انسان خود بھی ان حشریات میں سے ایک ہے اور اگر تم آج بھی اس کی ابتدائی شکل دیکھو تو...''

''بس بھئی، بس۔ میں اس وقت کوئی لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں، مجھے بہت کام ہے۔''

''مگر یہ کیا کر رہے ہو؟''

''تریچور کے ایک قدیم تاریخی مندر کی گری ہوئی دیوار کی تہ سے یہ کتبہ برآمد ہوا ہے۔ میں اسے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

Akram Allahabadi

''یہ کیڑے مکوڑے جیسی زبانیں واقعی تمہاری سمجھ میں آتی ہیں، یا یوں ہی اندازے سے ٹھوک دیتے ہو؟''

''کیڑے مکوڑوں کا محکمہ تو تمہارے سپرد ہے، میرا خیال ہے ان کی زبانیں تم ہی بہتر سمجھ سکتے ہو گے۔'' ڈاکٹر مدن نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ دونوں ہی اس وقت خوشگوار موڈ میں تھے۔

''اوہ ہاں، میں تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ یہاں کیوں آیا تھا۔'' ڈاکٹر دوبے کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

''کوئی نیا جانور دریافت کیا ہو گا؟''

''نہیں بھائی، وہ پیر کے دن کرن کی اٹھارویں سالگرہ ہے اور تم نے کوئی بہانہ کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔''

''اٹھارویں سالگرہ؟ تو کیا کرن اٹھارہ سال کی ہو گئی؟ اتنی جلدی'' ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔

''کل تک تو مجھے بھی خبر نہیں تھی، مگر شام کو اسی نے کہا تھا کہ وہ ۱۸ سال کی ہو گئی ہے۔'' ڈاکٹر دوبے نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا اور اس کے بعد دونوں اس سوچ میں پڑ گئے کہ کیا واقعی کرن اتنی جلدی اٹھارہ سال کی ہو گئی ہے۔ انھیں خود ہی گزرتے دنوں کی خبر نہیں رہا کرتی تھی۔

''اچھا، میں چلتا ہوں، مگر دیکھو، یاد رکھنا، ورنہ کرن میرا دماغ چاٹ جائے گی۔''

''او کے، اولڈ بوائے۔'' ڈاکٹر نے اپنے کام میں مشغول ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ڈاکٹر کو اپنا گرگٹ یاد آ گیا۔ وہ ابھی تک دم کی طرف سے اس کی چٹکی میں لٹکا ہوا ہاتھ پیر مار رہا تھا۔

''یو اسٹوپڈ۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا ڈاکٹر کے روم سے نکل کر اپنے اسٹیڈی روم کی طرف

Akram Allahabadi

چلنے لگا، لیکن گرگٹ نے قطعی طور پر ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ وہ آزادی کی کوشش اب بھی کر رہا تھا اور جیسے ہی ڈاکٹر نے اپنے اسٹیڈی روم میں قدم رکھا، وہ ایک بار بڑی زور سے تڑپا۔ ڈاکٹر کی چٹکی پھسل گئی تھی اس لیے ایک جھٹکے سے اس کی چٹکی سے آزاد ہوتے ہی وہ فرش پر گر کر اتنی تیز بھاگا کہ ڈاکٹر کو نظر نہ آیا۔ وہ حلق پھاڑ کے چیخنے لگا۔

''چپراسی... مسٹر شرما... جگل... رشید... ارے لینا... وہ بھاگا... جلدی۔''

وہ لوگ دوڑ کر آ پہنچے۔ دروازے بند کر دیے گئے اور مفرور گرگٹ کی تلاش بڑی سرگرمی سے شروع ہو گئی، لیکن کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کس قدر خطرناک یا زہریلا ہوگا، اس لیے کوئی ہاتھ میں رول لیے ہوئے تھا، کسی نے جوتا ہی اتار کر ہاتھ میں لے رکھا تھا اور کوئی دونوں ہاتھوں پر کرسی اٹھائے مستعد تھا کہ خدانخواستہ اگر کہیں مفرور قیدی پھر کے حملہ کر بیٹھے تو اسے وہ مل فائیٹر کی طرح ڈاج دے سکے، یا نشانہ بیٹھ جائے تو قصہ ہی ختم کر دے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

# مجسمہ

چلتے چلتے وہ کباڑی کی دکان کے سامنے رک گیا۔

اس کے قدم اکثر یہاں رک جایا کرتے تھے۔ وہ باہر ہی سے دکان میں رکھی ہوئی نئی پرانی چیزوں کا ایک جائزہ لیتا اور یا تو آگے بڑھ جاتا یا اندر داخل ہو جاتا۔

یہ اس کا معمول تھا اور اس کباڑ خانے کا مالک حسن ظفر بھی اس گاہک سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ ویسے صحیح معنوں میں اسے کباڑ خانے سے زیادہ ایک چھوٹا سا میوزیم کہنا موزوں رہتا، کیوں کہ حسن ظفر نے نوادرات کے بیش بہا نمونے یہاں جمع کر رکھے تھے۔ وہ نمونے جو عہدِ قدیم کی کسی تہذیب یا فن کاری کی انمول تخلیقات کا مظہر تھے، مگر ان کی قیمت جاننے والے ہی جانتے تھے، عام لوگوں کے لیے تو یہ کباڑ خانہ ہی تھا، جہاں مختلف قسم کی پتھر اور کانسی کی مورتیوں اور مجسموں سے لے کر مختلف ادوار کے فنِ نقاشی کے نمونے، ظروف، پارچہ جات، سامانِ آرائش اور بہت سی ایسی چیزیں موجود تھیں جو اپنی مثالی حیثیت رکھتی تھیں۔

وہ ان چیزوں کو ضرورت مندوں سے بہت سستے داموں خرید کر رکھا کرتا تھا اور اکثر ایسا ہو جاتا کہ کوئی ایک چیز اس کی دکان میں سالوں رکھی رہ جاتی اور کوئی اس کا قدر داں نظر نہ آتا، مگر جب اتفاق سے کوئی آجاتا تو وہ ساری کسر ایک ہی مرتبہ نکال لیا کرتا تھا۔ وہ اس کی منہ مانگی قیمت وصول کر لیتا تھا۔

ڈاکٹر مدن اس کا ایسا ہی گاہک تھا۔ وہ اب تک اس سے کئی بار ایسی تاریخی نوادرات خرید چکا تھا جن کی اہمیت عام لوگوں کی نظروں میں دو کوڑی کی بھی نہ ہوتی، لیکن ایک ماہرِ آثاریات کے لیے وہ کتنے دلچسپ اور کتنے قیمتی ہوتے تھے، یہ یا تو وہ خود جانتا ہوگا، یا حسن ظفر، جو گاہک کا موڈ دیکھ کر ہی اس کی دلچسپی کا اندازہ لگا لیا کرتا۔ اسے اس جگہ دکان کرتے

پندرہ سال ہو گئے تھے اور اس سے پہلے پچیس سال تک اس کا باپ یہی دکان چلاتا آیا تھا۔ یہ دکان جسے وہ چلاتا تھا، کباڑ خانے کی حیثیت میں بھی اس کے خاندان کا پورا خرچ چلاتی تھی اور بظاہر بے وقعت نظر آنے والی اس کی اشیاء کبھی کبھی تو ایسی اتنی قیمت دے جاتیں کہ وہ خود کو خاصہ بڑا بیوپاری سمجھنے لگتا۔ اسے جب بھی کہیں سے کوئی تاریخی مجسمہ، کوئی قدیم کتبہ، کوئی پرانی چیز مل جاتی، وہ اسے ڈاکٹر مدن کے لیے ضرور رکھ چھوڑتا اور جب ڈاکٹر مدن اسے دیکھ کر انکار کر دیتا تب ہی اسے کسی دوسرے کے ہاتھوں فروخت کرتا۔

ڈاکٹر بھی عجیب آدمی تھا، بس اپنی ہی دھن میں غرق اس کی عادت تھی کہ دکان میں داخل ہونے کے بجائے وہ پہلے باہر ہی سے اندر کی چیزوں کا جائزہ لیتا اور جب کوئی چیز اسے پسند آجاتی تب اندر جا کر اس کا سودا کرتا۔ ظفر جانتا تھا کہ وہ یہاں کی نیشنل اکیڈمی آف سائنٹیفک اینڈ کلچرل ریسرچ کے شعبۂ آثار کا انچارج ہے اور یہی نہیں بلکہ خاندانی طور پر ایک دولت مند آدمی بھی ہے، اس لیے وہ اس کا ادب اس طرح کرتا جس طرح انگلستان کے دکاندار ہندوستان کے راجاؤں یا شہزادوں کا کرتے ہیں، لیکن قیمت کی وصولی میں کبھی کوئی کسر نہ چھوڑتا۔ اس کا کہنا تھا کہ بیوپار میں مروت اپنے باپ سے بھی نہیں کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر ابھی ابھی اکیڈمی سے لوٹا تھا اور آج وہ فرصت سے بھی تھا، کیونکہ موسمی تعطیلات کل سے شروع ہو رہی تھیں اور دو مہینوں کی فرصت تھی۔ مکان اکیڈمی کی عمارت سے قریب بھی نہ تھا، مگر اس کا اصول یہ تھا کہ وہ پیدل ہی آتا اور پیدل ہی جاتا اور اس فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے اس کی نظریں حسن ظفر کی دکان کی طرف ہر بار اٹھا کرتی تھیں۔

اس وقت وہ دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اندر ایک پرانی میز پر رکھے ہوئے اس مجسمے کو دیکھ کر رک گیا تھا جو نہ جانے کیوں اسے بھلا معلوم ہوا تھا۔ وہ تھا بھی اتنا ہی خوبصورت اور پرکشش، مگر شاید برسوں سے گرد و غبار میں اٹا رہا تھا، جس کی وجہ سے اس پر میل کی تہہ جم گئی تھی اور دکاندار نے بھی اسے صاف کرنے کی تکلیف نہ کی تھی، کیونکہ ایسی چیزیں گرد

آلودحیثیت میں شاید زیادہ قابلِ توجہ ثابت ہوتی تھیں، یا ممکن ہے اس کی صفائی کے لیے اسے فرصت نہ ملی ہو۔

ڈاکٹر مدن کو اندر آتے دیکھ کر حسن ظفر اپنے دوسرے گاہکوں کو چھوڑ کر فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے ڈاکٹر کے سامنے ادب سے جھک کر دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔

''آیے جناب، بہت دنوں میں آپ کے قدم غریب خانے میں آئے ہیں۔''

''یہ غریب خانہ نہیں، کباڑ خانہ ہے۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔

''ایک ہی بات ہوئی۔ کباڑ اور غریب خانے کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔''

''خیر خیر، ویسے میں یہ مجسمہ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ڈاکٹر غیر ضروری گفتگو سے احتراز کرتے ہوئے اس مجسمے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ضرور ملاحظہ فرمایے، جناب۔ یہ مورتی حضرت عیسٰی سے بھی دس لاکھ سال قبل کی ایک...'' حسن ظفر نے اس مجسمے کی اہمیت بڑھانے کے لیے زمین آسمان کی قلابے ملانے چاہے۔

''کم از کم مجھ سے یہ غلط قسم کی کنوینگ نہ کیا کرو۔'' ڈاکٹر نے ہنس کر اسے ٹوک دیا۔ ''یہ مجسمہ زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی ہزار ہزار سال پرانا ہے۔'' وہ اس مجسمے کو قریب سے دیکھ کر اور انگلیوں سے چھوتے ہوئے بولا۔

''دو ڈھائی ہزار سال بھی کچھ کم تاریخی اہمت نہیں رکھتے، جناب۔''

لیکن ڈاکٹر نے جیسے اس کے الفاظ سنے ہی نہیں۔ وہ اس مجسمے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ بڑی خوب صورتی سے تراشا گیا ایک حسین نقش و نگار والی پر شباب دوشیزہ کا مجسمہ تھا، جو کچھ اس انداز سے کھڑی ہوئی تھی، جیسے چلتے چلتے تھم گئی ہو۔ اس کا ایک پیر آگے بڑھا ہوا تھا اور پچھلا پیر کچھ اس طرح اٹھا تھا کہ پنجہ زمین پر تھا اور ایڑی عمودی شکل میں اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ بڑا پر کشش انداز خرام تھا یہ۔ اس کے بدن پر قدیم رومی اسٹائل سے ملتا لتا کپڑے کا گھیرا کمر سے

رانوں تک لپٹا ہوا تھا اور سینہ اسی کپڑے کی پٹی سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ پتھر پر تراشیدہ تھا۔ اسے جس نے بھی اور جب بھی تراشا ہو، لیکن وہ کسی عظیم فن کار کے ایک حسین تخیل کی منہ بولتی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ اس کے خوب صورت ڈیل کو اتنی موزونیت سے تراشا گیا تھا کہ خواہ مخواہ طبیعت اسے دیکھتے رہنے کو چاہتی اور اور تصور میں ایک ایسی بھرپور جوانی کا نقشہ کھنچ جاتا جو اگر اپنے ان خوب صورت نقوش کے ساتھ زندہ ہوتی تو سراپا قیامت کہلاتی۔ اس نے اٹھے ہوئے ایک ہاتھ کی چٹکی سے اس کپڑے کو جو دھوتی گھاگھرا یا چادر بھی ہو سکتی تھی، اس طرح تھام رکھا تھا کہ آگے بڑھا ہوا پیر پنڈلی سے اوپر گھٹنا اور ران کے نچلے حصے تک عریاں ہو گیا تھا۔ اور اس کی تراش بڑی متناسب تھی۔ اس کے سر پر دائیں بائیں بال انتہائی خوب صورت انداز میں منتشر تھے اور پیچھے کی طرف ان کا جوڑا بندھا ہوا تھا۔ گھنی پلکوں کے ساتھ اس کی آنکھیں کھلی ہی رکھی گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سامنے کی طرف دور بہت دور تک وہ کھوئے ہوئے انداز میں کچھ دیکھ رہی ہو۔ وہ کسی طرح درگا، گورا، پاربتی یا کسی دیوی یا مذہبی تقدس کی کوئی مورتی نہ معلوم ہوتی تھی، بس ایک مست شباب حسن جو جیتے جاگتے پتھر میں مجسم ہو گیا ہو۔

''کیا قیمت ہو گی اس کی؟'' ڈاکٹر نے حسن ظفر سے پوچھا۔

''قیمت... ان نادرات کی کوئی قیمت ہو سکتی ہے بھلا، لیکن آپ سے میں کچھ زیادہ لے بھی تو نہیں سکتا۔'' وہ ڈاکٹر کو ممنونِ احسان کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''صرف پچاس دے دیجیے۔ حالاں کہ میں نے تو اسے ایک بڑی دور سے آئے ہوئے سو سالہ بوڑھے سے ۴۸ روپوں میں خریدا تھا، کل دو روپے منافع لے رہا ہوں آپ سے۔'' اس نے ڈاکٹر کو یقین دلانا چاہا۔ ڈاکٹر جواب میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے جیب سے پرس نکالا اور پچاس روپے گن دیے۔ مجسمہ فوراً ایک بڑے سے موٹے کاغذ میں لپیٹ کر حسن ظفر نے ڈاکٹر کے حوالے کر دیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ڈھائی فٹ لمبا تھا اور وزن میں میں کچھ ۱۵، ۲۰ پونڈز کے لگ بھگ رہا ہو گا۔ ڈاکٹر کو بہر حال اسے بغل میں دبا لینے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ اسے لے

کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆

ٹیلی فون کی طرف نوکر کو ہی متوجہ ہونا پڑا، کیونکہ گھنٹی دیر سے بج رہی تھی اور ڈاکٹر اپنی اسٹیڈی میں بند تھا۔ آج اسے اسٹیڈی میں بند ہوئے تیسرا دن تھا۔ وہ صرف غسل کرنے اور حوائج ضروری کے لیے ہی باہر نکلتا، ورنہ نوکر ناشتہ اور کھانا وہیں پہنچا دیا کرتے تھے۔ اکیڈمی میں تعطیلات شروع ہو چکی تھیں، اس لیے فرصت ہی فرصت تھی اور فرصت کے یہ دن وہ زیادہ تر اسٹیڈی میں ہی گزارا کرتا تھا۔ مختلف آثار کی تاریخی حیثیت پر غور کرتے اور نئی دریافتوں کے امکانات کا جائزہ لیتے، یا پھر چینی ہتھوڑی سنبھالے کوئی مجسمہ تراشتے۔ اس نے اسٹیڈی میں دیواروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے چبوترے بنوا رکھے تھے جن پر اس نے ایسے مجسمے نصب کیے تھے جو مختلف ادوار کی مختلف قوموں اور نسلوں کی ان کے مخصوص خدوخال اور لباس میں نمائندگی کرتے۔ ان میں نینڈرتھال (Neanderthal) سے موجودہ زمانے کے انسان تک موجود تھے۔ یہ مجسمے اس کے خود تراشیدہ تھے۔ ویسے تحقیق آثار قدیمہ کے سلسلے میں دستیاب ہونے والے مجسمے، کتبات اور ظروف اور فن کاری کے دوسرے نمونے اس نے علیحدہ علیحدہ سجا رکھے تھے۔ ان میں سے بعض تو اس کے ذاتی طور پر تلاش کردہ تھے اور بعض محکمۂ آثار کی امانت تھے۔ ان میں اجنٹا، ایلورا، اپاٹلی پتر، موہن جوداڑو اور ٹیکسلا تک کے تاریخی نادرات موجود تھے۔

فون ڈاکٹر دوبے کا تھا۔ ''صاحب اسٹیڈی میں ہیں۔'' نوکر نے بتایا۔

''ان سے کہو یہ فرصت کے دن ہیں۔ فون پر بلاؤ انھیں۔'' ڈاکٹر دوبے کی آواز آئی۔

''صاحب، انھیں کوئی ڈسٹرب کرے تو ہتھوڑی کھینچ کر مار دیتے ہیں۔''

''اوہ، اچھا میں خود آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے رسیور رکھ دیا اور بمشکل دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ اس کی کار آ پہنچی۔ نوکر نے اشارے سے اسے بتایا کہ وہ دروازہ ہے۔ اور ڈاکٹر نے جب دروازہ اندر کی طرف دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ ڈاکٹر مدن دروازے کی طرف پشت کیے ایک قدِ آدم مجسمے کی تراش میں مشغول تھا۔

''کیا یہ کھانے کا وقت ہے؟'' اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر ڈاکٹر دوبے کو اپنا نوکر سمجھ کر پوچھا۔

''نہیں، یہ تو دوسروں کو انتظار کرانے کا وقت ہے۔'' ڈاکٹر دوبے نے اندر داخل ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ، ڈاکٹر تم۔'' مدن چونکا۔ ''ارے مگر ہاں، لو میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔'' وہ سٹپٹائے ہوئے انداز میں ہتھوڑی ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ یہی حال رہا تو کسی دن تم خود بھی پتھر کا ایک مجسمہ بن جاؤ گے۔'' ڈاکٹر دوبے نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''آئی ایم ساری، ڈاکٹر۔'' ڈاکٹر مدن نے معذرت کی۔

''اب کیا میں ہاتھ جوڑ کر تم سے تیاری کے لیے درخواست کروں؟''

''بہت ناراض معلوم ہوتے ہو، بس پانچ منٹ، میری تیاری میں کیا ہے۔'' یہ کہتا ہوا ڈاکٹر مدن اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اسٹیڈی میں ہی بنے ہوئے باتھ روم میں چلا گیا۔ یہ اس نے گلادے کے ماڈل تیار کرنے کے بعد ہاتھ منہ دھونے کے لیے اسٹیڈی روم میں بنوا رکھا تھا۔ ڈاکٹر دوبے وہیں ٹھہر کر اس ادھورے مجسمے کو غور سے دیکھنے لگا، جس پر ڈاکٹر مدن کام کر رہا تھا۔ پھر اس کی نظر سامنے ایک چبوترے پر رکھے ہوئے اس چھوٹے مجسمے پر پڑ گئی جو ڈاکٹر مدن کباڑی کی دکان سے خرید کر لایا تھا۔ واقعی ہو بہو پوز لیا تھا اس نے۔ کھڑے ہونے کا بالکل

وہی انداز، صرف صفائی اور چہرے کے نقوش کی کسر رہ گئی تھی۔ پھر ڈاکٹر کی طائرانہ نظر اس کی اسٹیڈی کا جائزہ لینے لگی۔ واقعی بڑی شاندار جگہ تھی یہ بھی۔ فنِ سنگتراشی کے بہترین نمونوں سے آراستہ، جیسے ایک میوزیم ہو۔ وہ دل ہی دل میں ڈاکٹر مدن کی فنکارانہ عظمت کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''ڈاکٹر، تم تو بڑے اچھے اسکلپچر (Sculpture) ہو۔'' اس کے باہر آتے ہی ڈاکٹر دوبے نے تعریف کی۔ ''تعجب ہے کہ اپنی فنکاری کے ان نمونوں کو تم آرٹ کی نمائش میں کیوں نہیں رکھتے؟''

''میں نمائش پسند نہیں ہوں۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔ ''یہ میرا اپنا شغل ہے۔''

''خیر خیر، میں جانتا ہوں تم ضدی آدمی ہو، تم سے کون سر مارے گا۔''

ڈاکٹر مدن مسکرا کر رہ گیا۔ وہ باہر نکل آئے۔ ڈاکٹر کو تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس نے ٹائی درست کرنے کی بھی پرواہ نہیں کی، ویسے ہی ڈاکٹر دوبے کی کار میں آ بیٹھا۔

☆☆☆☆☆☆

کرن ڈاکٹر دوبے کی ایک ہی اولاد تھی اور بچپن سے ہی وہ اس کی ہر سالگرہ دھوم سے مناتے آئے تھے۔ آج بھی ان کا بنگلہ اس شان سے سجا ہوا تھا جیسے کسی کی شادی ہو رہی ہو۔ سال کے اس دن وہ اپنے ان تمام دوستوں اور واقفکاروں کو یاد کر لیتے تھے، جو انھیں سال کے بقیہ دنوں میں اتفاق سے بھی یاد نہ آیا کرتے تھے۔ مہمان سب ہی آ چکے تھے، لیکن ان میں 'لیٹ لطیف' اگر کسی کو کہا جا سکتا تو وہ ڈاکٹر مدن ہی تھا۔ اور ڈاکٹر دوبے کا خیال صحیح ہی نکلا۔ اسے ان سب باتوں کا کہاں ہوش تھا۔ وہ صرف اپنے فن کا دیوانہ تھا۔ بہر حال وہی ہوا جس کی توقع تھی، یعنی ڈاکٹر مدن نہیں آیا اور ڈاکٹر دوبے کو آخر خود ہی اسے لینے جانا پڑا۔

ان کے اندر داخل ہوتے ہی لوگ چونک پڑے۔ تو یہی تھا ڈاکٹر مدن۔ کئی نگاہیں

اس کی طرف اٹھ گئیں اور خصوصاً بعض لڑکیاں تو اسے اس وقت تک توجہ سے دیکھتی رہیں جب تک کہ وہ ڈاکٹر دوبے کے ساتھ چلتا ہوا ہال کے درمیان تک نہ پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر معصومیت، سادگی اور شرمیلا پن نمایاں تھا اور اس کی پرکشش وجاہت کے ساتھ اس کی یہ خصوصیتیں بعض لڑکیوں کے لیے بے حد کشش کا باعث تھیں۔

''ارے، بیٹی کرن۔'' ڈاکٹر نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی کرن کو آواز دی۔

''آئی، ڈیڈی۔'' وہ اٹھ کر فوراً ہی آ گئی۔ موسمِ بہار کی ایک نوخیز کلی۔ وہ آج اپنے سالگرہ کے دن بھی سادے سفید کپڑے پہنے ہوئی تھی۔ یہ لباس اس کا من پسند تھا۔ صرف اس پر ریشمی سیاہ بالوں میں سفید پھولوں کے ایک جوڑے کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ہنستی تو اس کے موتی جیسے دانت بڑے بھلے لگتے اور اس کے حسین چہرے پر نکھار بھی غضب کا تھا۔ عنفوان شباب کی چمک نگاہوں میں نمایاں تھی اور رخسار پر کشمیری سیب جیسی سرخی۔ ڈاکٹر مدن اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

''ارے، کرن ہی تو ہے، کیا پہچانے نہیں؟'' ڈاکٹر دوبے نے کہا۔

''یہ وہ کرن تو ہرگز نہیں ہو سکتی، میلے چہرے والی لڑکی، جس کی ناک ہر وقت بہتی رہتی تھی۔'' ڈاکٹر مدن یہ کہہ ہی رہا تھا کہ کرن نے اپنی پرانی، بلکہ بچپن کی عادت کے مطابق ناک ایک بار زور سے سڑکی اور پھر مسکرا دی۔

''بھئی تم خود ہی پوچھ لو اس سے کہ اصلی کرن ہے یا نقلی، میں تو چلا۔ اب پارٹی شروع ہو جانی چاہیے۔'' ڈاکٹر دوبے یہ کہہ کر نوکروں کی طرف متوجہ ہو گیا اور کرن ڈاکٹر مدن کے ساتھ ساتھ اس صوفے کی طرف چلنے لگی جو ابھی تک خالی تھا۔ شاید ڈاکٹر مدن کے لیے ہی، یا ممکن ہے کہ محض اتفاق سے۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی بڑی ہو گئی ہو، میں تو تمہارے لیے کچھ اور ہی تحفہ لایا

تھا۔'' ڈاکٹر مدن نے بے تکلفی سے کہا۔ ویسے اس کا تخاطب ایسا تھا جیسے کوئی بزرگ کسی بچے سے باتیں کرتا ہے۔

''آپ آ ہی گئے، یہی کیا کم ہے، ورنہ ڈیڈی تو کہہ رہے تھے کہ آپ اکثر وعدہ کر کے بھول جایا کرتے ہیں۔ خود ڈیڈی کا بھی یہی حال ہے۔ کل سے پہلے یہ بھی بھولے ہوئے تھے کہ آج میری سالگرہ ہے۔'' اس نے شرمائے ہوئے سے لہجے میں جواب دیا۔

''ہم لوگ مصروف ہی اس قدر رہتے ہیں، یہ ہمارا قصور نہیں۔'' ڈاکٹر مسکرا دیا۔

''ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ آپ لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتے؟''

''یہ بات تو نہیں ہے، مگر بے سبب لوگوں سے ملنا جلنا بھی تو کوئی عقلمندی نہیں ہے۔''

''اوہ، تو آپ واقعی تنہائی پسند ہیں۔''

''قطعی نہیں، میرے چاروں طرف آدمی ہی آدمی رہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا سا ہے کہ وہ بے جان ہوتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان جانداروں سے بدرجہا بہتر ہیں جنہوں نے خدا کی زمین پر فساد پھیلا رکھا ہے۔''

''آپ تو پادریوں جیسی باتیں کرنے لگے۔''

''کبھی کبھی سوچ لیتا ہوں۔ ویسے میں کوئی سیاست دان یا مبلغ نہیں ہوں کہ اسے پرابلم بنا لوں۔''

''بیٹھیے نا۔'' کرن نے صوفے کے پاس رک کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں، وہ تحفہ تو بھول ہی گیا میں۔ حالانکہ تین گھنٹوں سے میری جیب میں ہی پڑا ہے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی اور کرن کی طرف بڑھا دی۔ کرن نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر پُرمسرت انداز میں ڈبیہ اس سے لے کر اسے کھول کر دیکھنے لگی، مگر ڈبیہ کا ڈھکن کھلتے ہی وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے حلق سے

Akram Allahabadi

ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی اور ساتھ ہی ڈاکٹر دوبے کا قہقہہ ہال میں گونج اٹھا۔اس نے اس ڈبیہ سے ایک مینڈک کا بچہ اچک کر باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔البتہ ڈاکٹر مدن کے ہونٹوں پر صرف خفیف سی مسکراہٹ تھی،ایسی جو کئی سال پہلے، جب کرن بچی تھی،اس کے ہونٹوں پر اس وقت نمایاں ہو جایا کرتی جب وہ ڈاکٹر دوبے سے ہی ہسٹری کے سبق لینے آیا کرتا تھا اور کسی نہ کسی بہانے کسی نہ کسی چیز میں رکھ کر مینڈک کا ایک بچہ کرن کے ہاتھ میں دے دیتا۔کرن بچپن سے ہی مینڈک سے سب سے زیادہ ڈرتی تھی۔وہ اچھل کر چیختی ہوئی بھاگنے لگتی اور ان دنوں کا مدن اس کی یہ کیفیت دیکھ کر قہقہے لگایا کرتا۔ڈاکٹر مدن کو آج کرن کی سالگرہ پر وہی دن پھر یاد آ گئے تھے اور تحفے کی ڈبیہ میں بند کر کے آج بھی اس کے لیے ایک مینڈک کا بچہ ہی لایا تھا۔حالانکہ خود کرن اور اس کی آس پاس موجود سہیلیاں بھی یہی سمجھی تھیں کہ کوئی قیمتی انگوٹھی ہو گی اس میں۔ بہر حال کرن کو اس طرح اچھلتے دیکھ کر پہلے تو سب چونک پڑے،مگر جب جب انھوں نے اس مینڈک کو دیکھا جو اسی ڈبیہ سے اچھل کر فرش پر آیا تھا اور جس سے خوفزدہ ہو کر وہ دور ہٹ گئی تھی،تو ان کے بھی قہقہے چھوٹ گئے۔

''بھئی، بہت خوب۔'' ڈاکٹر دوبے قریب آ کر مدن کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولا۔مگر کرن اسے روٹھی روٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ایسی خطرناک نظریں جو غارتگرِ عقل و ہوش کہی جاتی ہیں۔اور ڈاکٹر کی خفیف سی مسکراہٹ اب بھی برقرار رہی۔وہ کرن کو بھول کر ڈاکٹر دوبے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اب دیر کیا ہے، ڈاکٹر؟''

''بس اسٹارٹ۔ارے،مگر ہاں، یہاں چند نئے دوست بھی آئے ہوئے ہیں، پہلے میں ان سے تمہارا تعارف تو کرا دوں۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر دوبے نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ایک ایک مہمان سے اس کا تعارف کرنے لگا۔ان میں وہ جوان لڑکیاں بھی تھیں، جو ڈاکٹر کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔ان میں سے کچھ تو اس سے ہاتھ ملاتے وقت اس قدر کھو گئی تھیں کہ

ڈاکٹر ان سے مصافحہ کرنے کے بعد آگے بھی بڑھ گیا، اور وہ اسی طرح کھڑی رہ گئیں اور بعض تو اس سے ہاتھ ملاتے وقت ہلکی سی سسکیاں بھر کر رہ گئی تھیں۔

مگر ایک مہمان تو ڈاکٹر مدن سے بھی لیٹ لطیف ثابت ہوا۔ یہ مرزا جی تھے، جو ڈاکٹر دوبے کے آبائی دوستوں میں سے تھے۔ یعنی ان کے باپ اور ڈاکٹر دوبے کے باپ میں دوستی رہی تھی۔ پھر ان دونوں کے باپوں میں بھی، اور اس طرح نہ جانے یہ سلسلہ کہاں تک چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر کو ان کی عادت معلوم تھی اس لیے اس نے مرزا جی کا انتظار بھی نہیں کیا۔

''اماں لاحول ولاقوۃ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ۹ بجے کا اعلان کیا اور سوا نو بجے ہی پارٹی شروع کر دی۔'' مرزا جی نے اندر آتے ہی بغیر سلام دعا کے ڈاکٹر دوبے کی خبر لی۔

''تو پھر کیا اگلے سال شروع کی جاتی۔'' ڈاکٹر دوبے نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ آپ کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکتے۔''

''بھئی، ہم تو سمجھے تھے کہ ہندوستان نائم ہے۔ خیر خیر، دیر آید درست آید۔''

''ارے بھئی مرزا، تم آ گئے؟'' مہمانوں میں سے ایک اور بوڑھی آواز انھیں سنائی دی۔

''سبحان اللہ، عینک لگا کر بھی آپ کو نظر نہیں آ رہا؟'' مرزا جی نے پلٹ کر خود بھی انھیں اپنی عینک کے موٹے شیشوں سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

مرزا کی کی شخصیت بڑے لوگوں کے لیے بڑی دلچسپ واقع ہوئی تھی۔ ویسے بھی وہ اپنے چوڑی دار پاجامے، کالی اچکن اور سفید دو پلیا ٹوپی میں خاصے مرادآبادی نظر آتے تھے۔ انھیں مخاطب کرنے والا بھی ایک خرانٹ قسم کے پنڈت جی تھے۔ خرانٹ وہ یوں نظر آتے تھے کہ کسی بوڑھے گدھ کی گردن کی کھال کی طرح بوڑھاپے نے ان کی گردن کی کھال بھی لٹکا دی تھی۔ مرزا جی ڈاکٹر دوبے سے پیچھا چھڑا کر لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے پنڈت جی کے پاس پہنچ گئے۔

Akram Allahabadi

اور پنڈت جی نے کچھ اس انداز سے ان کا خیر مقدم کیا جیسے صاحب خانہ وہی ہوں۔ پہلے کرن نے ۱۸ شمعیں بجھا کر سالگرہ کا کیک کاٹا۔ پھر لوگوں نے اسے تحفے پیش کیے اور دُست خود بہانِ خود ڈوالی دعوت شروع ہوگئی۔ درمیان میں رکھی ہوئی بڑی میزوں پر کھانے کی وہ تمام چیزیں موجود تھیں جو مہمانوں کے لیے تیار کی گئی تھیں اور بلا تکلف یہاں ہر شخص کو اپنی پسند کی چیز خود ہی اٹھانی پڑتی۔ یہ سلسلہ تقریباً نصف گھنٹے تک چلتا رہا۔ لوگ ٹہل ٹہل کر کر کھاتے رہے اور دو دو، چار چار کے گروپوں میں بٹ کر آپس میں گفتگو کرتے رہے۔

دعوت ختم ہو جانے کے بعد ایک میوزیکل پروگرام تھا جس میں کرن کے کالج کے کچھ دوست لڑکے اور لڑکیاں گٹار، وائلن اور بنجو وغیرہ پر کچھ ترانے اور گیت پیش کرنے والے تھے۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر جا بیٹھے اور کرن اس صوفے پر آ بیٹھی جہاں ڈاکٹر مدن اور ڈاکٹر دوبے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

ڈاکٹر مدن نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کرن نے اس کی طرف دیکھ کر پلکیں جھکا لیں۔ بچپن کی بات اور تھی، مگر اب تو وہ بڑی سی ہو چکی تھی اور مدن بھی کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ ایک سنجیدہ قسم کا پوری طرح جوان آدمی۔ اسے اب اس سے نگاہیں ملاتے ہوئے شرم بھی محسوس ہوتی تھی اور ہچکچاہٹ بھی۔ کئی سالوں سے انھوں نے ایک دوسرے کو نہ دیکھا تھا، مگر آج تو وہ بالکل ہی مختلف طریقے سے ملے تھے۔ چونکے ہوئے سے، شرمائے ہوئے سے۔ اور مدن کو آج اپنے قریب دیکھ کر کرن کو اپنے وہ تمام سنہرے خواب سچ ہوتے نظر آ رہے تھے، جو وہ عرصے سے دیکھتی رہی تھی۔ ایک خوبصورت پروقار اور صحت مند آدمی کا خواب، جسے وہ اپنے من مندر کا دیوتا بنا سکے۔ کاش وہ اسے پہلے ہی دیکھ کر پاتی تو آج شاید یہ خواب حقیقت کا روپ اختیار کر گئے ہوتے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آج وہ مدن سے زندگی میں پہلی بار مل رہی ہو۔ لیکن ڈاکٹر مدن اس سے متاثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر دوبے اپنے شاگردوں سے بھی دوستوں جیسی بے تکلفی سے پیش آتا تھا، لیکن مدن تو صرف نوجوانی میں ہی اس کا شاگرد رہا تھا۔ اس کے بعد تو

اس نے انفرادی طور پر اپنا مستقبل بنایا تھا۔کئی سالوں سے وہ ایک دوسرے سے دور رہے تھے۔ جب مدن آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور اسی دوران میں انگلستان کے ایک مجسمہ ساز سے اس نے فنِ سنگتراشی میں دسترس حاصل کر لی تھی۔اس کے بعد جب وہ ہندوستان آیا تو اس نے ہندوستان کے قدیم فنِ سنگتراشی پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا اور وہیں سے اسے محکمۂ آثارِ قدیمہ میں محقق کی حیثیت سے تقرری مل گئی۔بعد میں وہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا کہ اسے اکیڈمی میں اس شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔یہیں دوبارہ وہ اور ڈاکٹر دوبے اکٹھا ہوئے اور شاگرد اور استاد کے پرانے تعلق کو بھول کر ان میں برابر کی دوستی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

بڑی عجیب بات یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہی رہتے تھے، صرف درمیان میں ایک سڑک تھی، جو اپنے بازار کی وجہ سے کافی آباد رہتی۔دوسری طرف ڈاکٹر کے بنگلے کا کمپاؤنڈ تھا۔اور یہی نہیں، بلکہ ڈاکٹر مدن کے آرام کے کمرے کی کھڑکیاں بھی اسی سمت کھلتی تھیں، جدھر سڑک کے رخ کھلنے والی ڈاکٹر کے بنگلے کے ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں تھیں، لیکن اس کے باوجود وہ کئی سالوں تک ایک دوسرے سے اپنے گھروں پر نہیں ملے تھے۔ ملاقات ہوتی تو بس اکیڈمی میں اور وہ بھی اتفاقاً۔بلکہ جب اکثر اکیڈمی کے دروازے پر، یا کمپاؤنڈ میں کبھی ان کا آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ بے خیالی کے عالم میں ایک دوسرے کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پاس سے گزر جاتے اور کافی دور جا کر انھیں اس کا احساس ہوتا کہ انھوں نے کس کے سلام کا جواب دیا تھا یا کس کو سلام کیا تھا۔

انھیں ہو سکتا ہے کہ اسی وجہ سے بعض لوگ کریک کہتے ہوں، لیکن ان کا اپنا ماحول تھا، جس میں وہ مطمئن اور خوش تھے۔انھیں ایک دوسرے سے کبھی شکایت بھی نہ ہوتی، کیونکہ عادتوں میں دونوں ایک ہی جیسے واقع ہوئے تھے۔

''آپ تو کبھی یہاں آتے ہی نہیں ہیں۔'' کرن نے ڈاکٹر مدن سے شکایت لہجے میں کہا۔

''اتفاق سے تمہاری ہر سالگرہ کے موقع پر میں یہاں موجود نہیں رہتا۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی عین وقت پر دعوت دینے کی عادت ہے۔ ابھی پچھلے سال ہی میں ان دنوں ہڑپہ میں آثار کی تلاش کرا رہا تھا۔ اس سے پچھلے سال بھی چار مہینے تک میں پٹنہ کے مضافات میں ایک کھنڈر کی جڑیں کھدوا رہا تھا۔ بس ایسی ہی مصروفیتیں رہتی ہیں کچھ۔ یہ تو اتفاق ہے کہ پچھلے چند مہینو سے میں زیادہ مصروف نہیں ہو۔'' ڈاکٹر نے تفصیلی جواب دیا۔

''تو پھر اب تو آیا کریں گے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں، کیوں نہیں۔'' ڈاکٹر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''ان کے وعدوں کا بھروسہ نہ کرنا، بیٹی۔ یہ غیر حاضر قسم کے آدمی ہیں۔'' ڈاکٹر دوبے درمیان میں بول اٹھا۔

''اور آپ مجھ سے زیادہ۔'' ڈاکٹر مدن نے برجستہ کہا۔

''خیر خیر، دونوں سہی۔'' ڈاکٹر گردن ہلانے لگا۔

''اجی واللہ، آپ؟'' مرزا جی کہیں سے گھومتے ان کے قریب آکر رکتے ہوئے ڈاکٹر مدن کو دیکھ کر بولے۔ وہ ڈاکٹر دوبے سے مدن کا تعارف حاصل کرنا چاہتے تھے۔

''یہ ہمارے دوست اور اکیڈمی کے شعبۂ آثار قدیمہ کے انچارج ڈاکٹر مدن ہیں۔'' ڈاکٹر دوبے نے مدن کا تعارف کرایا۔

''خوب، بہت خوب۔ آثارِ قدیمہ۔ واللہ پرانی تہذیب کی یادگاریں آپ ہی لوگوں کے دم سے زندہ ہیں۔'' مرزا نے ڈاکٹر مدن سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگے۔

''اور آپ ہیں مرزا جی۔ ہمارے خاندانی دوستوں میں یکے از آثارِ قدیمہ۔'' ڈاکٹر دوبے نے مرزا جی کا تعارف کرایا۔

''اجی ناچیز کس لائق ہے۔'' مرزا جی نے اظہارِ انکساری کیا۔

''اسی لیے تو آثارِ قدیمہ میں شمار ہے۔'' ڈاکٹر دوبے نے ان کی خاکساری کو خاک

میں ملا دی۔

''جی ہاں، گئے وقتوں کی یادگار ہیں ہم لوگ۔'' مرزا جی نے ٹھنڈی سانس بھر کر شاعری کی۔

''اوہ، یہ تو میں بتانا ہی بھول گیا تھا کہ مرزا جی خیر سے شاعر بھی ہیں۔''

''جی، بس یوں ہی کچھ ٹوٹی پھوٹی کہہ لیتا ہوں۔''

''ٹوٹی پھوٹی چیزیں میرے بڑے کام کی ہوتی ہیں۔'' ڈاکٹر مدن بول پڑا۔ اور مرزا جی اسے اپنی تعریف سمجھ کر جھک جھک کر تسلیم کرنے لگے۔ کرن نے ہنسی روکنے کے لیے ساری کا پلو دانتوں میں دبا لیا۔

''جناب کا دولت خانہ کہاں واقع ہے؟'' مرزا جی نے سوال کیا۔

''جغرافیہ عرض کروں یا محل وقوع؟'' ڈاکٹر مدن نے ان کے ہی لہجے میں جواب دیا۔ اور اس بار کرن ہنس ہی پڑی۔ مرزا جی نے عینک کے شیشوں کی اوٹ سے اسے گھورا۔

''یہ لو، اس میں ہنسنے کی کونسی بات ہے۔ ہر چیز کا جغرافیہ ہوا کرتا ہے۔'' وہ بولے۔

''مثلاً؟'' ڈاکٹر دوبے نے ٹوکا۔

''مثلاً... مثلاً یہ کہ ہر چیز کے شمال، جنوب، مشرق، مغرب میں کوئی نہ کوئی چیز واقع ہوا ہی کرتی ہے اور وہ چیز خود بھی کہیں نہ کہیں واقع ہوتی ہے۔''

''بھئی، واقعی آپ بڑی گہرائی تک پہنچ گئے۔'' ڈاکٹر مدن نے کہا۔

''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ مرزا جی سحر العلوم ہیں پورے۔ دنیا کا کونسا علم ان کی دانست سے باہر ہوگا۔'' ڈاکٹر دوبے نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''اجی کیا خاک، یہ تو یوں ہی، یعنی کہ یوں ہی۔ میرا مطلب ہے کہ میرے ابا جان مرحوم، خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، کہا کرتے تھے کہ بیٹے دنیا میں عزت کے ساتھ جینا ہے تو عالم فاضل بنو۔'' مرزا جی سے اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔

Akram Allahabadi

''یہی نہیں، بلکہ وہ جو روس نے مصنوعی چاند چھوڑا ہے نا، مرزا جی کا کہنا ہے کہ وہ کوئی نئی بات نہیں۔ان کے دادا جان مرحوم اپنے زمانے میں ہی اس سے بڑی بڑی چاند آسمان پر چھوڑ چکے تھے۔''ڈاکٹر دوبے نے کہا۔

''جی ہاں۔دادا جان تو روشن چاند اڑاتے تھے۔یعنی ایسی روشن قندیلیں جو کئی کئی ہزار کوس تک آسمان میں جا کر غائب ہو جایا کرتی تھیں۔''

''ہم تو سنیں، بھئی دوبے جی۔کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''پیچھے سے پنڈت جی کی آواز آئی اور ڈاکٹر دوبے انھیں دیکھ کر چونک پڑے۔

او ہو، آپ کہاں تھے، پنڈت جی۔بھلا کیا بات ہوئی کہ مرزا جی موجود ہیں اور پنڈت جی کا پتہ نہیں۔''انھوں نے کہا۔

''جہاں مرزا جی، وہاں چوبے، اور جہاں چوبے...''پنڈت جی نے کہنا چاہا۔

''وہاں مرزا۔''مرزا جی خود ہی بول پڑے۔

''مگر یہ چاند واند کا کیا ذکر تھا؟''

''مرزا جی کہتے ہیں کہ کہ ان کے دادا روس سے بھی اونچے چاند اڑایا کرتے تھے۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہ اڑاتے ہونگے۔میرے پرنانا شنکر دیال چوبے جی خود پتنگ میں لالٹین باندھ کر اڑایا کرتے تھے۔اور صاحب اسی پر کیا، اس مصنوعی چاند سے اونچے تو ہم لوگوں نے کنکوے اڑائے ہیں۔''

''ضرور اڑائے ہونگے۔''ڈاکٹر مدن کو بولنا پڑا۔

''بھئی، سچ پوچھو تو میں اسے کفر سمجھتا ہوں، یعنی کہ انسان کی بھلا کیا مجال ہے کہ چاند سورج بنائے اور اڑانے لگے۔نعوذ باللہ، خدائی کا دعوا ہوا یہ تو۔''مرزا جی نے سنجیدہ ہو کر فرمایا۔

''مرزا جی، یہ سائنس کا دور ہے۔''ڈاکٹر دوبے نے سمجھانا چاہا۔

''آپ لوگوں کا کیا، دھرم مذہب تو سب انگریزی کتابوں میں گم ہوگیا۔ وہ لوگ جو بھی بے پر کی اڑا دیتے ہیں، آپ لوگ آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتے ہیں۔'' مرزا جی نے ضد کی۔

''رام رام، کیا یہ کلجگ لگا ہے۔'' پنڈت جی نے تائید کی۔

''چوبے جی، سائنس کا دھرم سے کوئی واسطہ ہے نہ ٹکراؤ۔'' ڈاکٹر مدن نے چوبے جی کو سمجھایا۔

''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ بڑے بڑے سائنسدان تو ہیں دنیا میں۔ چاند اور تارے بنائے جا رہے ہیں۔ آسمان پر جانے کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ مگر ذرا کوئی اتنی بھی ہمت رکھتا ہے کہ کسی کی آئی ہوئی موت کو ٹال دے۔'' چوبے جی نے اپدیش شروع کر دیا۔

''جی ہاں۔ دیکھیے نا۔'' مرزا جی فوراً بول اٹھے۔ ''آج تک موت کا بھی علاج ڈھونڈ سکا ہے کوئی۔ بڑے بڑے دعوے کرنے والے دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتے ہیں۔ دھری رہ جاتی ہے ساری شیخی، جب بلاوا آ جاتا ہے۔''

''خیر، اپنا اپنا خیال ہے۔'' ڈاکٹر مدن نے بات ختم کرنے کی نیت سے کہا۔

''مجھے تو اجازت دو، ڈاکٹر۔''

''اتنی جلدی۔''

''تمہیں تو معلوم ہے کہ کام ادھورا چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''اچھا، خیر۔'' ڈاکٹر دوبے نے بادلِ نخواستہ اجازت دے دی۔

''جا رہے ہیں آپ؟'' کرن نے اسے ٹوک دیا۔

''ہاں، مجھے اب جانا چاہیے۔''

''شاید طبیعت گھبرا رہی ہوگی یہاں۔''

''نہیں بھئی، ایک کام ادھورا چھوڑ کر آیا ہوں۔''

Akram Allahabadi

''پھر نہ آئیں گے کبھی؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔یعنی کہ جب فرصت ملی۔''

''کرن اسے خود دروازے تک چھوڑنے آئی، مگر مرزا جی اور چوبے جی وہیں مصنوعی چاند سے لے کر دھرم کرم اور دہریت کی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

اس مجسمے کو قدِ آدم حیثیت میں ڈھالنے میں اسے پورا ایک ہفتہ لگ گیا۔مگر جس وقت اس نے اسے آخری ٹچز دے کر پلیٹ فارم پر کھڑا کیا تو خود ہی مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔واقعی وہ اپنے اس مخصوص اندازِ خرام اور اپنے حسن و تناسب کے ساتھ ایک شاہکار نظر آ رہا تھا۔ایک ایسا شاہکار جو اتفاق سے ہی کسی عظیم فنکار کے ہاتھوں سے ڈھلتا ہے۔وہ اسے اتنا بھایا کہ اس نے اسے اپنی اسٹیڈی میں سب سے موزوں جگہ پر عین اپنی آرام کرسی کے سامنے رکھا۔اس کام کو ختم کرنے کے بعد وہ بڑے مطمئن انداز میں اسی کرسی پر بیٹھ کر اسے دیر تک دیکھتا رہ گیا۔وہ مجسمہ بڑا ہو کر اب انتہائی پر کشش معلوم ہو رہا تھا۔خدا جانے کونسی خوبی تھی اس میں جو ڈاکٹر مدن کو بے ساختہ اس کی طرف کھینچے لے رہی تھی۔اس کی شکل اب واضح ہو کر اتنی خوبصورت بن گئی تھی کہ اگر وہ کوئی جیتی جاگتی ہستی ہوتی تو ڈاکٹر جیسا خشک قسم کا آدمی بھی اس کے لیے پاگل ہوا اٹھتا۔نہ تو اس کے حسن میں الوہیت تھی نہ وہ کوئی اپسرا معلوم ہوتی تھی۔اس میں سادگی تھی، مگر اتنی پر کشش جیسے فطرت کا سارا حسن اسی سادگی میں سمٹ آیا ہو۔مگر اس کے اس حسن، اس کے جسمانی تناسب اور اس کے نقوش کے علاوہ بھی اس میں کوئی ایسی چیز، کوئی ایسی خاص بات تھی جو ڈاکٹر کو کھینچ رہی تھی۔وہ کیا خصوصیت تھی؟ یہ وہ خود بھی ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا۔ایک اور سوال اس کے ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا۔یہ مجسمہ کس دور کا اور کس کا ہو سکتا ہے۔اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ہندوستان کے کسی قدیم کلچر سے ہی تعلق رکھتا تھا۔اس نے

آثارِ قدیمہ کی ٹورِیکارڈ بک نکالی اور غور سے ایک ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ان میں کچھ مجسموں کی تھیں، کچھ کھنڈرات کی، کچھ ظروف اور دوسرے آثار کی۔اگر یہ کسی دیوی کی مورتی ہوتی تو اس کی تراش کا یہ اسٹائل ہرگز نہ ہوتا۔اس کا لباس اس کا اندازِ خرام سب کچھ مختلف ہوتے۔وہ کسی تخیلی پیکر یا مافوق الفطرت ہستی کا مجسمہ نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ اس میں کوئی ایسی علامتیں نہیں تھیں۔

سوچتے سوچتے اس کا ذہن جنوبی ہند کی قدیم تاریخ کے ابواب میں بھٹکنے لگا۔ کرناٹک...نہیں اجنٹا...شاید...ایلورا...شاید...اور پھر وہ یہیں تھم گیا۔یہ مجسمہ ضرور ایلورا یا اجنٹا کی قدیم تہذیب سے تعلق رکھتا تھا۔چہرے کے نقوش اور تراش کی صفائی اسے اسی دور کے کسی عظیم فن کار کی تخلیق ظاہر کر رہی تھی۔مگر ایلورا یا اجنٹا میں تو اس نے صرف ایسی مورتیاں دیکھی تھیں جو یا تو راجاؤں، رانیوں، داسیوں وغیرہ کی تھیں یا دیوتاؤں کی۔ان غاروں میں موجود مجسمے اس ڈھب سے مختلف تھے۔پھر وہ کون ہوسکتی تھی؟

ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی نرتکی رہی ہو، یا پھر کوئی رانی۔مگر یہ دونوں خیالات بھی اس کے ذہن میں استحکام نہ پاسکے۔ایک نرتکی کو اتنی اہمیت نہیں دی جاسکتی تھی کہ اس کا مجسمہ تراشا جائے۔اور رانیوں جیسا انداز اس کا نہیں تھا۔تو پھر ممکن ہے وہ...شیوجی...یا کسی بڑے دیوتا کی کوئی خاص پجارن یا پھر کوئی راج نرتکی رہی ہو۔بہت ممکن ہے۔مگر ہاں کوئی بڑی پجارن ہی ہوگی۔اس کا لباس تو یہی ظاہر کر رہا ہے۔اس کے زیور، اس کی چال اور اس کا مخصوص اسٹائل۔ اور راج نرتکی ہو تو اپنے زمانے کی ایک چلتی پھرتی قیامت ہوگی، جس کے حسن اور جس کے وقار نے اسے ایک مجسمے کی شکل میں ایک تاریخی حیثیت دے دی۔

مگر معلوم نہیں کب وہ یہی سب سوچتے سوچتے سوگیا اور اس وقت نیند سے چونکا جب اسے کندھے پر کسی کا سخت ہاتھ محسوس ہوا۔اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ میجر ناصر تھا۔

''سنا ہے بہت مصروف ہو آج کل؟'' میجر نے پوچھا۔

''دیکھا نہیں تم نے، یہی مجسمہ تراش رہا تھا۔ دیکھو، کیسا ہے؟''

''بھئی واللہ، بہت خوبصورت... شاہکار... کس کا ہے یہ؟'' میجر یہ پوچھتا ہوا بیٹھ گیا۔

''میں کیا بتاؤں، میں خود اسی الجھن میں مبتلا ہوں۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے اب محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کوئی جانی پہچانی سی چیز ہو، حالاں کہ میرے اپنے خیال کے مطابق یہ اب سے کم از کم ڈھائی ہزار سال پرانا مجسمہ ہے۔ ایلورا یا اجنٹا کی تہذیب کے اس دور کا جب فنِ سنگتراشی ہندوستان میں یقیناً بڑے عروج پر رہا ہوگا۔ یہ تراش تو اسی دور کے کسی فنکار کی معلوم ہوتی ہے۔''

''میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ کس کا ہو سکتا ہے؟''

''ظاہر ہے کہ وہ ایک عورت یا ایک لڑکی ہی رہی ہوگی۔ اغلب ہے کہ اس دور کے کسی بڑے مندر کی کوئی بہت خوبصور پجارن جو اپنے بے مثال حسن کے ساتھ اتنی اہمیت بھی رکھتی ہو کہ اس کا مجسمہ تراشا جا سکتا ہوگا۔''

''کیوں، مجسمہ کسی بھی خوبصورت عورت کا تراشا جا سکتا ہوگا؟''

''نہیں۔ اس زمانے میں صرف مقدس ہستیوں کے ہی مجسمے تراشے جایا کرتے تھے۔ اور پھر زیادہ تر وہ مندروں کی ہی زینت بنا کرتے تھے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''مندروں کی؟ لیکن ایلورا وغیرہ میں مندر کہاں ہیں؟''

''تاریخ دانوں نے بنا سمجھے بوجھے ان مندروں کو غار لکھ مارا ہے۔ بھلا خود ہی سوچو کون فنکار اتنا بے وقوف ہوگا کہ دور جا کر جنگلوں میں چھپے ہوئے وہ غاروں میں اپنی فنکاری کے شاہکار تراش کر آ جائے تا کہ نہ کوئی کبھی انھیں دیکھ سکے نہ کبھی اس کا ذکر یا تعریف ہو۔''

''میں سمجھا نہیں، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

Akram Allahabadi

''جی، یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب سے دو ڈھائی ہزار سال قبل ایلورا میں ضرور کوئی بڑا آباد شہر، بلکہ کسی جنوبی سلطنت کا دارالحکومت ہی رہا ہوگا۔ اور یہ غار جن میں فنِ سنگتراشی کے یہ نمونے ملتے ہیں اس زمانے کے مندر رہے ہوں گے۔ پھر ممکن ہے روم کے شہر پمپی آئی (Pompeii) کی طرح وہاں کوئی بڑا خوفناک زلزلہ آگیا ہو اور ساری آبادی نیست و نابود ہو کر رہ گئی ہو۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ایلورا کسی زمانے میں تہذیب کا مرکز تھا؟'' میجر نے پوچھا۔

''یقیناً۔ ایلورا، اجنٹا دونوں۔''

''کچھ بھی سہی، ہے بڑی خوبصورت چیز یہ۔'' میجر نے بھی تعریف کی۔

''ذرا تم کھڑے تو ہو جاؤ۔'' ڈاکٹر نے کچھ سوچتے سوچتے اچانک کہا۔ میجر کچھ نہ سمجھ کر گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''اب ذرا اس کمرے میں ادھر سے ادھر تک چل کر دکھاؤ۔'' ڈاکٹر نے فرمائش کی۔

''کیا مطلب؟'' میجر اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا، جیسے اسے کچھ ہو گیا ہو۔

''ارے بھئی، چلو تو، پیر تھوڑی گھس جائیں گے۔'' ڈاکٹر نے اصرار کیا۔

''اچھا لو۔'' میجر یہ کہہ کر اپنے فوجی انداز میں کمرے میں چلنے لگا۔ مگر وہ دیکھ کر ڈاکٹر کی دماغی حیثیت کے بارے میں شبے میں پڑ گیا کہ وہ بڑے غور سے اس کے اٹھتے گرتے قدموں کو دیکھ رہا تھا۔

''بس بس۔'' ڈاکٹر نے اچانک کہا اور پھر مایوسی سے اپنی آرام کرسی میں دھنس گیا۔ میجر پائپ سلگاتے ہوئے اس کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

''آخری کیا پاگل پن تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس مجسمے کا یہ اندازِ خرام، یہ عمودی شکل میں اس کی

اٹھی ہوئی ایڑی، اپنی ادا میں کوئی خصوصیت رکھتی ہے یا عام آدمیوں جیسی ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''مجھے تو شبہ ہو رہا ہے کہ تم بوڑھے ہونے سے پہلے ہی پاگل ہو جاؤ گے، ڈاکٹر۔'' میجر نے مسکرا کر کہا۔

''مذاق اڑانے جیسی بات تو نہیں ہے یہ۔ بعض شخصیتوں کے بعض مخصوص ادائیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس مجسمے کا یہ انداز خرام ہی مجھے سب سے زیادہ متاثر کر رہا ہے۔''

''تم اپنی خاص اور مخصوص گردان میں الجھے رہو، میں تو چلا۔ میں فوجی آدمی ہوں اور فوجی آدمی...''

''دماغی حیثیت سے بلینک ہوتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

''اس لیے وہ بوڑھے ہو کر بھی صحیح الدماغ رہتے ہیں۔'' میجر نے جواب دیا۔ ''اچھا چھوڑو، میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ کل ٹینس میچ ہے۔ میرے میٹ کی حیثیت سے کھیلنا پسند کرو تو بہت اچھا ہے۔''

''مقابلہ کس سے ہے؟''

''مس گرارڈ اور لیڈی کاؤس جی۔''

''شرم نہ آئے گی تمہیں عورتوں سے مقابلہ کرتے؟''

''عورتیں خود زندگی کے ہر شعبے میں اب مردوں سے مقابلہ کر رہی ہیں۔''

''نا بھئی، اگر خدانخواستہ ہار گئے تو غیرت سے کہیں ڈوب مرنا پڑے گا۔''

''تمہیں ڈوب مرنے سے نہیں روکوں گا۔ ہم فوجی تو فتح و شکست سے دوچار ہوا ہی کرتے ہیں۔'' میجر نے کہا۔

''ناک نہ ہوتی ہوگی؟''

''چلو یوں ہی سہی، بولو، آ رہے ہو نا؟''

Akram Allahabadi

''اب تم گلے پڑے ہو تو آنا ہی پڑے گا۔ مگر جلدی کیا ہے، چائے پی کر جانا۔''

''میں صرف مقررہ اوقات پر ہی چائے پیتا ہوں۔''

''تمہاری زندگی کیا ایک ٹائم ٹیبل ہو گئی ہے؟''

''ہونا ہی چاہیے، تمہاری طرح نہیں کہ ہفتوں پتھروں سے سر پھوڑتے رہتے ہو۔ سچ پوچھو تو میں تو آنا رقدیمہ والوں کو خود آنا رقدیمہ سمجھتا ہوں۔''

''ناسمجھی ہے تمہاری۔''

میجر ہنستا ہوا چلا گیا، لیکن ڈاکٹر ابھی تک اپنی آزمائش سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ میجر کا ہر انداز فوجی تھا، اسی طرح رفتار بھی۔ بس ایک جھک ہی تو تھی، جو وہ اس مجسمے کے اندازِ خرام کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس میں اسے نہ جانے کیوں بلا کی کشش نظر آ رہی تھی۔ یوں تو ایک چٹکی سے اٹھائے ہوئے کپڑے کی وجہ سے عریاں ہو جانے والی اس کی پنڈلی، عمودی شکل میں اٹھی ہوئی پیر کی ایڑی اور زمین پر ٹکے ہوئے خوبصورت پنجے کے ساتھ، واقعی غور پر دیکھنے والوں کی نظروں کو اپنی طرف کچھ دیر کے لیے ٹھہرا لیتی تھی۔ ماڈرن آرٹ کے دلدادگان کے لیے اس کی اس ادا میں بلا کی سیکس اپیل تھی، لیکن ڈاکٹر کی نگاہیں تو اس میں ایک انفرادیت، ایک انوکھا پن تلاش کر رہی تھیں۔ وہ جب غور سے اس مجسمے کی طرف دیکھتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ اسی کی طرف دیکھ رہی ہو۔ اس کا آگے بڑھتا ہوا قدم ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کے سینے پر ہی پڑ رہا ہو۔

وہ نیم رقصاں کیفیت میں ایک ایسی ساحرہ معلوم ہوتی تھی جس کے گھنگھروؤں کی جھنکار پر لاکھوں دل والے جھوم اٹھتے ہوں اور اگر وہ شیو، برہما، یا وشنو کی کوئی پجارن رہی ہو تو یقیناً دیوتاؤں کی مورتیوں کے سامنے رقص کرتے وقت اس کے گھنگھروؤں کی جھنکار لوگوں پر ایک از خود رفتگی کا عالم طاری کر دیتی ہوگی۔ اس کا دل بے اختیار چاہنے لگا کہ کاش وہ اس زمانے میں ہوتا اور قریب سے اس جیتی جاگتی قیامت کو دیکھ سکتا۔

وہ اس کے بارے میں جس قدر سوچتا جا رہا تھا، اسی قدر اس مجسمے کا حسن، اس کشش اس کی نگاہوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر خیالات کا یہ سلسلہ ملازم نے آ کر توڑا۔ وہ اس کے لیے کافی تیار کر کے لایا تھا اور وہ ٹرے کو تپائی پر رکھ کر لوٹنے لگا تو ڈاکٹر کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

''دینو، یہاں آؤ۔''

''جی مالک۔'' وہ قریب آ گیا۔

''ذرا ادھر سے ادھر تک چل کر دکھاؤ۔ میں تمہاری چال دیکھنا چاہتا ہوں۔''

دینو کی سمجھ میں اس قسم کا حکم قطعی نہیں آیا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات ڈاکٹر اپنی دھن میں عجیب عجیب باتیں بھی کیا کرتا تھا، مگر یہ تو کوئی نئی ہی سنک تھی۔

وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا کمرے میں چلنے لگا اور اسے یہ دیکھ کر اور حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر اس کے پیروں کے اٹھنے اور گرنے کے انداز کو دیکھ رہا تھا۔

''اونہوں، ایسے نہیں... اور آہستہ۔'' ڈاکٹر نے اپنی نظریں اس کے پنجوں اور ایڑی پر جمائے ہوئے کہا اور دینو آہستہ ہو گیا، مگر اس کی کھوپڑی اس وقت چکرائی ہوئی تھی۔ آخر یہ تھی کیا سنک۔ اور پھر دینو کی کھوپڑی میں بھی ایک نئی سنک سما گئی۔ وہ سمجھا شاید ڈاکٹر صاحب مختلف چالوں کا تجربہ کر رہے ہوں، اس خیال کے آتے ہی وہ عورتوں کی طرح مٹک مٹک کر چلنے لگا۔ اور ڈاکٹر کو ہنسی آ گئی۔

''چل بھاگ یہاں سے، گدھے۔'' ڈاکٹر نے اس کی پیٹھ پر دھول جما کر کہا۔ اور وہی کیا، کوئی بھی اس بوڑھے آدمی کی یہ حرکت دیکھ کر اپنی ہنسی نہ روک سکتا۔

دینو ڈاکٹر کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوا کمرے سے کھسک گیا اور ڈاکٹر اس کی حماقت کو دوبارہ یاد کر کے آپ ہی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

اسے پاگل پن سمجھا جائے یا کوئی انہونی بات، لیکن نہ جانے کیوں وہ مجسمہ ڈاکٹر کے دل و دماغ پر اس طرح چھا گیا جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا وجود رہی ہو اور ڈاکٹر کے ذہن کے کسی خانے میں اس کی یاد ہزاروں برس سے محفوظ چلی آ رہی ہو۔ وہ اپنی ضروری مصروفیتوں کے اوقات کے علاوہ اس مجسمے کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھ کر اسی کو گھورا کرتا۔ ایسی نظروں سے جیسے اس کے گھورتے گھورتے اس میں جان ہی پڑ جائے گی۔ جیسے اس کا بڑھا ہوا پیر اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ اچانک حرکت میں آ کر رقص کرنے لگیں گے اور جیسے اس کے خوبصورت پیروں میں پڑے ہوئے گھنگھروؤں کی جھنکار اچانک اس کے کانوں میں رس گھولنے لگے گی۔ وہ جس نے زندہ اور خوبصورت لڑکیوں اور عورتوں کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس مجسمے کے لیے اپنے اندر ایک نامعلوم سی عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کیوں...؟ یہ تو خود بھی نہ جانتا تھا، مگر کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے ہزاروں میل دور سے... بہت دور سے، یا خدا جانے کہاں سے۔ گھنگھروؤں کی مدھم مدھم جھنکار اس کے کانوں کو سنائی دے رہی ہو اور بے ساختہ اس کی نظریں اس مجسمے کی طرف اٹھ جاتیں۔ وہ اسے گھورتے گھورتے تھک کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور اس وقت گھنگھروؤں کی تھاپ اسے اپنے ذہن کے ہر گوشے پر پڑتی محسوس ہوتی۔ اس کے تصور میں مجسمے کے اٹھے ہوئے ہاتھ اور بڑھا ہوا پیر اچانک حرکت میں آ جاتا اور وہ رقص کرنے لگتی۔ ایک والہانہ رقص، جس کی ہر ادا پر ڈاکٹر کا دل زور سور سے دھڑک اٹھتا۔ اس نے ایک بار اس ذہنی الجھن سے اکتا کر اس مجسمے پر سفید کپڑا بھی ڈال دیا تھا، مگر پھر اسی کے ہاتھوں کو یہ پردہ اٹھانا پڑا۔ اس کا دل اسے دیکھے بغیر نہ مانا۔

یہ انہونی سی بات ہی تھی کہ وہ دو ڈھائی ہزار سال پرانے ایک پتھر کے مجسمے کے بارے میں اس طرح سوچ رہا تھا جیسے وہ ایک ہستی ہو اور اسے اس سے کوئی گہرا قلبی لگاؤ ہو۔ ذہنی انتشار کے اس عجیب سے ماحول میں اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اور وہ سوچنے لگا

کہ ایک بار جی کڑا کریا تو اس مجسمے کو ہی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، یا خود کہیں چلا جائے۔ اسٹیڈی میں نہ جانا تو اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کا دل ہی نہ مانتا۔

کل شام کو بازار سے گزرتے ہوئے بھی اس سے ایک عجیب حماقت ہو گئی اور اسے محسوس کرنا پڑا تھا کہ اگر یہی حال رہا تو وہ لوگ جو اس کی عزت کرتے ہیں اس پر ہنسنا شروع کر دیں گے۔

کل بازار سے گزرتے ہوئے وہ راہ چلتی عورتوں کے اندر خرام اور ان کے پیروں کی اٹھتی ہوئی ایڑیاں دیکھتا چل رہا تھا اور اسی محویت کے عالم میں ایک بار وہ ایک بوڑھی عورت سے ٹکرا گیا، جس نے معافی مانگنے پر بھی اسے معاف نہ کیا اور نہ جانے کیسی کیسی جوان گالیاں دیتی رہ گئی۔ ایک بار ایک کیلے کے چھلکے پر پھسل کر گرتے گرتے بچا تھا۔ اور سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات تو اس وقت ہوئی جب فریز رس اسٹورز کے سامنے ایک عیسائی لڑکی اسے اس طرح اپنی ننگی پنڈلیوں اور پیروں کو دیکھتے چلتے محسوس کر کے اس پر بگڑ گئی۔ شکل سے بھی انتہائی شریف اور سنجیدہ نظر آنے کے باوجود وہ ڈاکٹر کو کوئی برا آدمی ہی سمجھی اور جب اس نے اچانک پلٹ کر اس پر اپنے غصے کی بوچھاڑ کر دی تو ڈاکٹر گھبرا گیا، کیونکہ اس قسم کے دلچسپ تماشے دیکھنے کے لیے لوگ جلدی جمع ہو جایا کرتے ہیں۔ بہر حال اس کی بجائے ایک دوسرے شریف آدمی نے اس لڑکی کو جواب دے کر اس کی جان بچائی۔

"میڈم، آپ اتنی ہی حیادار ہیں تو کھلی پنڈلیاں لے کر بازار میں کیوں گھومتی پھرتی ہیں۔" اس نے کہا اور لڑکی لاجواب سی ہو گئی۔ وہ چاہتی تو کہہ سکتی تھی کہ عیسائیوں کا یہی نیم عریاں لباس ہے جو مغربی تہذیب نے ہمیں عطا کیا ہے، لیکن لوگ یہ بھی تو جانتے تھے کہ مغربی تہذیب میں ایسی باتوں کا مرا ماننے یا ان پر مشتعل ہونے کی بجائے لڑکیاں اپنے جسم کے کسی حصے کی نمائش پر اظہار پسندیدگی کیے جانے سے خوش ہو جایا کرتی ہیں۔ وہ یہ بھی نہ کر سکتی تھی، کیونکہ لباس مغربی اور ذہن مشرق و مغریب کے مابین معلق ہونے کے باوجود روح مشرقی تھی۔

وہ سٹپٹا کر لاجواب سی آگے بڑھ گئی، لیکن جب اسی آدمی نے ڈاکٹر کو بھی معاف نہ کیا تو ڈاکٹر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

اس نے کہا۔ ''آپ جیسی شریف صورت آدمی کو بھی سرِ بازار ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔'' وہ تو یہ ریمارک پاس کر کے آگے بڑھ گیا، مگر ڈاکٹر سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ وہ اسے کیا سمجھاتا کہ کسی اور نقطۂ نظر سے نہیں، وہ تو صرف اس ڈھائی ہزار سال پرانے مجسمے کے اندازِ خرام اور مخصوص انداز سے عمودی شکل میں اٹھی ہوئی اس کی ایڑی سے مناسبت یا مماثلت کی تحقیق کرنے کے لیے وہ صرف عورتوں کی چال پر غور کر رہا تھا کہ آیا یہ خصوصیت صرف اسی مجسمے، یا عام طور پر عورتوں کی چال ہی ایسی ہوتی ہے۔ اگر وہ بتاتا بھی تو اس کا یہ فلسفہ، یہ جھک کسی کی سمجھ میں نہ آتی اور لوگ اسے پاگل سمجھ بیٹھتے۔

بہر حال گھر واپس لوٹنے پر وہ اندر سے بہت خجل تھا۔ وہ ایک معزز آدمی تھا۔ اس کی شرافت اس کے کردار پر کسی قسم کے شبے کی گنجائش نہ تھی، مگر آج جو حماقت اس سے سرزد ہو گئی تھی، اگر وہ اس کے کسی واقف کار یا دوست کی نظر سے گزری ہو گی تو وہ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا، یا دوسروں سے اس کے بارے میں کیا کہے گا۔

بہر حال ایک گزرنے والی مصیبت کی طرح اس سے وہ حماقت سرزد ہو ہی چکی تھی اور اب اس کے لیے دل کو زیادہ دکھانا، دماغ پر زیادہ زور دینا فضول ہی تھا، اس لیے اپنے آپ کو سزا کے طور پر بہت سی ڈانٹیں سنانے کے بعد وہ رات کا کھانا کھائے بغیر ایسا سویا کہ سویرے ہی اٹھا۔

باتھ روم میں دانتوں کو برش کرتے جاتے ہوئے اس کی نظر جب سامنے پڑی تو سڑک کے اس پار اسے ڈاکٹر دوبے کے بنگلے کے سڑک کی سمت والے کمرے کی کھلی کھڑکی میں ایک پنجرے میں ٹنگا وہ چنڈول نظر آیا جو اکثر صبح صبح اسے اپنی منحوس شکل دکھایا کرتا تھا۔

وہ کھڑکی میں ہی رک کر سوچنے لگا۔ خود اس کی زندگی بھی اس چنڈول جیسی ہے۔

فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ایک پنجرے میں قید ہے اور وہ باہر آزاد ہو کر بھی ذہنی الجھنوں میں قید ہے، وہ ان سے آزاد نہیں ہو پا رہا، جب تک کہ اس کے ذہن کو ان عجیب سوالات کا جواب نہ مل جائے جو اس مجسمے کے بارے میں آپ سے آپ اس کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ چنڈول بھی اس وقت تک آزاد نہیں ہو پاتا جب تک کہ اس کے دن پورے نہ ہو جائیں، یا کسی کے ہاتھ پنجرہ کھول کر اسے آزاد نہ کر دیں۔ مگر اس کی گتھی تو کسی کے ہاتھ بھی نہیں سلجھا سکتے تھے۔ کوئی اس کی پرابلم کو اوّل تو سمجھ ہی نہ سکتا، اور اگر وہ سمجھانے کی کوشش بھی کرتا تو یقیناً اسے اس کا خبط سمجھ کر اس میں کوئی دلچسپی نہ لیتا۔

اس انہماک میں اسے یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ سامنے کھڑکی میں کرن کب آ کھڑی ہوئی۔ وہ اس وقت چونکا، جب اسے پیچھے سے نوکر کی ہنسی سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو، نوکر کھڑکی کے باہر ہی کچھ دیکھ کر ہنسا تھا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھا تو اسے کرن نظر آ گئی۔ وہ جھینپ سا گیا۔ نوکر کمبخت یہی سمجھا ہوگا کہ وہ کھڑکی میں کھڑا ہو کر سامنے والی لڑکی سے نظر بازی کر رہا ہے۔ مگر نوکر کی ہنسی کی وجہ اس کا حلیہ بھی تھا۔ ڈاکٹر مدن گون پہنے بغیر ویسے ہی صرف چڈی اور بنیان میں کھڑکی پر کھڑا تھا اور اسے یہ احساس بھی نہ ہوا کہ سڑک پار کی کھڑکی سے اگر ایک جوان لڑکی اسے اس عالم میں دیکھ لے گی تو کیا سوچے گی۔ صرف یہی نہیں بلکہ دانت گھسنے کے برش کی جگہ قلم اس کے ہاتھ میں تھا اور دوسرے میں کولینوس کا ٹوتھ پیسٹ۔ بہر حال نوکر کی ہنسی کے ساتھ اسے ساری حماقتوں کا احساس بہ یک وقت ہو گیا۔ اس نے جھنجلا کر قلم بستر پر پھینکنے کی بجائے ٹوتھ پیسٹ بستر پر پھینک دیا اور تپائی پر سے برش اٹھا لیا، پھر برش پھینک کر ٹوتھ پیسٹ اٹھا لیا اور جب نوکر پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا تو ڈاکٹر مدن نے وہ دونوں چیزیں اس کے سر پر کھینچ ماریں۔

''تو یہاں کیا کر رہا ہے صبح صبح؟''

''صاحب، چائے تیار ہے۔'' وہ بمشکل سنجیدہ ہو کر بولا۔

''لاکر رکھ دو...اور گیٹ آؤٹ...سمجھے...اور ہاں...اب اگر تمہاری بتیسی نکلی تو سر توڑ دوں گا تمہارا۔''

''اچھا، صاحب۔'' نوکر مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے باہر چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر کو واقعی طور پر غصہ کبھی نہیں آتا۔ یہ ڈانٹ تو محض جھینپ مٹانے کی خاطر تھی۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر کو یاد آیا کہ سڑک پار جس کھڑکی سے وہ ایک لڑکی جھانک رہی تھی، وہ تو ڈاکٹر دوبے کا بنگلہ ہے...پھر وہ لڑکی...؟ وہ ضرور کرن رہی ہوگی...مگر وہ اسے جھانک کیوں رہی تھی؟ وہ سوچنے لگا اور اس کے دماغ نے خود ہی اسے جواب دے دیا کہ جس طرح تم بس یوں ہی کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے تھے۔ خیر ہوگا۔ وہ سر کو جھٹک کر گون اٹھاتا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔ اسے ناشتہ کرنے کے بعد آج تھوڑی دیر کے لیے بازار جانا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

# درگت

تھوڑی دیر کے بجائے وہ دوپہر کو واپس لوٹا۔نوکر کے پوچھنے پر صرف اتنا ہی بتایا کہ،' کیا اب تمہیں بھی یہ بتانا ضروری ہے کہ میں پبلک لائبریری چلا گیا تھا۔تم میرے گارجین ہو یا میری آیا'۔

نوکر بے چارہ کیا جواب دیتا،اس کی سمجھ میں بات نہ آئی سوائے 'آیا' کے اور یہ ہونا وہ کیسے تسلیم کر لیتا۔وہ اس کا کھانا پکانے چلا گیا،مگر جب ڈاکٹر مدن اپنی اسٹیڈی میں داخل ہوا تو غصے سے اس کا برا حال ہو گیا۔

''دینو...''وہ حلق پھاڑ کے چلایا۔

''جی،سرکار۔''باہر سے نوکر کی آواز آئی اور پھر وہ ڈرتے ڈرتے اندر پہنچا۔

''یہ تم آرٹسٹ کب سے بن گئے ہو؟''ڈاکٹر مدن نے اپنے تراشیدہ مجسموں کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا۔اور دینو حیرت سے دیکھنے لگا۔واقعی یہ تو عجیب بات تھی۔ وینس کے مجسمے کے چہرے پر کسی نے کالونچ سے مونچھوں کا اضافہ کر دیا تھا۔ایک فرعونِ مصر کے مجسمے میں کالی داڑھی کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ڈیانا کے ہاتھ میں جو کمان تھی،اس کا تیر نکال کر ہرکولس کی ناک کے سوراخ میں کھونس دیا گیا تھا۔اور چہرے پر مونچھوں اور داڑھی کا اضافہ نظر آ رہا تھا۔ایک مجسمے کا منہ کالا نظر آ رہا تھا۔اور ایک کے چہرے پر سیاہی سے پچکاری کی گئی تھی اور روہو کے ایک تخیلی مجسمے کے ہاتھوں میں اس نے برش اور چائنا انک کی دوات تھما دی تھی۔

دینو خود بھی مجسموں کی یہ درگت دیکھ کر منہ پھیر کر ہنس پڑا۔

''ابے،ہنستا ہے اوپر سے؟''ڈاکٹر بگڑ گیا۔''کس کی حرکت ہے یہ؟''

''صاحب،وہ آئی تھیں...''دینو کہتے کہتے جھجکنے لگا۔

''وہ کون؟''

''ڈاکٹر صاحب کی بیٹی۔''

''اوہ..''ڈاکٹر نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔''تو یہ کرن کی حرکت ہے۔''

''ہاں، صاحب، مگر میں نے نہیں دیکھا، صاب۔ میں تو رسوئی میں گیا ہوا تھا۔''

''مٹی کا تیل لا کر صاف کر دو انھیں۔''

یہ کہتا ہوا وہ آرام کرسی پر بیٹھنے جا ہی رہا تھا کہ اس کی نظر تپائی پر رکھے ہوئے اپنے پیڈ پر پڑ گئی۔ آرٹ کی خدمت یہاں تک کی گئی تھی۔ اس پر گول گول آنکھوں کے ساتھ ایک الو کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس کے نیچے ایک شعر لکھا تھا۔

نہ دیکھا ایسے تعجب سے بار بار مجھے

ڈاکٹر کا تمام غصہ کافور ہو گیا۔ اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''شریر کہیں کی۔'' وہ بڑبڑایا۔ اور پھر اسی شعر کے نیچے اس نے لکھ دیا۔

تر ا یہ حسن بنا دے نہ بے قرار مجھے

لیکن یہ شعر لکھتے وقت اس نے 'یہ حسن' کے سامنے سے ایک تیر کا نشان الو کے چہرے کی طرف بنا دیا تھا۔ پھر اس کاغذ کو پیڈ سے پھاڑ کر ایک لفافے میں رکھتے ہوئے اس نے دینو کو دیا کہ ڈاکٹر کے یہاں جا کر کرن کے ہاتھ میں دے آئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اسٹڈی کے ایک کونے میں رکھے ہوئے بک شیلف میں ایک کتاب ڈھونڈنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆

شام کے وقت وہ خلاف توقع ڈاکٹر دوبے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا اور ڈاکٹر دوبے عینک کی اوٹ سے اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اتنے میں سادہ سبز ساڑھی میں ملبوس کرن آ پہنچی۔ وہ اس

ساڑھی میں بہت بھلی معلوم ہورہی تھی ۔بالکل جیسے ہری ہری پتیوں میں گلاب کا ایک پھول کھلا ہوا ہو۔

''لو آگیا مجرم۔''ڈاکٹر دوبے نے کرن کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نمستے، ڈاکٹر صاحب۔'' وہ شریر انداز میں ڈاکٹر مدن کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''نمستے۔''ڈاکٹر مدن نے لہجے میں زبردستی کی ناراضگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی، یہ کیا حرکت تھی تمہاری، کرن؟'' ڈاکٹر دوبے بیٹی سے مخاطب ہوگیا۔

''ڈاکٹر مدن تو غصے میں سرخ ہوکر آئے تھے۔وہ تو میں نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا ہے۔''

''میں نے کیا کیا ہے، ڈیڈی؟'' کرن معصومیت سے بولی۔

''تم نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تم نے ان کے مجسموں پر مصوری کی مشق فرمائی ہے۔''

''نہیں تو، ڈیڈی۔بھلا میں اتنی بڑی آرٹسٹ کہاں۔''

''انھوں نے کسی کا منہ کالا کیا ہے، کسی کی ڈاڑھی مونچھیں بنا ڈالی ہیں۔''ڈاکٹر مدن نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''کیوں؟''ڈاکٹر دوبے نے مصنوعی غصے سے کرن کو عینک کی اوٹ سے گھورا۔

''نہیں تو۔پتا جی، وہ ان کا راہو نام کا بت ہے نا، وہ خود مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں، لاؤ مجھے برش اور دوات دے دو، میں ان شاہکاروں کو مکمل کردوں۔''کرن نے بڑی سادگی سے کہا۔ڈاکٹر مدن کی سنجیدگی برقرار نہ رہ سکی۔وہ مسکرادیا۔

''اور تم نے برش اور چائنا انک اٹھا کر دے دی، یہی نا۔''ڈاکٹر دوبے نے دہرایا۔

''تو اور کیا کرتی، وہ مجھے گھورنے لگا، میں ڈر گئی۔''

''جی ہاں، اور اس نے میرے پیڈ پر ان کی تصویر بھی بنائی تھی۔''ڈاکٹر مدن نے

Akram Allahabadi

کہا۔

''ڈیڈی، آپ خود اسی سے پوچھ لیجیے کس کی تصویر بنائی تھی اس نے۔'' کرن نے باپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آج تم دونوں نے مل کر مجھے بے وقوف بنانے کا پروگرام بنایا ہے کیا؟'' ڈاکٹر دوبے نے دونوں کو باری باری گھور کر پوچھا۔

''یہ لو، طویلے کی بلا، بندر کے سر۔'' ڈاکٹر مدن چونک پڑا۔

''کون میں؟ بندر تم خود میاں طویلے۔ بھول گئے، میں تمہارا استاد بھی ہوں۔'' ڈاکٹر دوبے نے روٹھنے والے انداز پیدا کر کے کہا۔

''ارے ارے، آپ کہاں پہنچ گئے، میں تو مثال دے رہا تھا۔ یہ سب شرارت تو کرن کی ہے۔ یہی ہمیں لڑا رہی ہے۔''

''اچھا.. تو پھر ہم دونوں مل کر اسے سزا دیں۔'' ڈاکٹر دوبے نے تجویز پیش کی۔

''ڈیڈی، آپ ان کی باتوں میں آ گئے۔''

''کوئی میں دودھ پیتا بچہ ہوں، مجھے مت بناؤ۔ میں نے تم سے بھی بڑے بڑے گرگٹ چرائے ہیں۔''

''ضرور چرائے ہوں گے۔'' ڈاکٹر مدن ہنس کر بول پڑا۔ اس وقت ڈاکٹر دوبے کو گرگٹ چرانے کا احساس ہوا۔

''خیر چھوڑیے یہ سب باتیں۔ ہاں ڈیڈی، وہ آپ کے اجنٹا، ایلورا کی سیاحت والے پروگرام کا کیا ہوا؟'' کرن نے اپنے باپ سے پوچھا۔

''ارے دیکھو، وہ تو بھول ہی گیا تھا میں۔ ارے بھئی مدن، تم بھی چلو نا۔ ہمارے پڑوس کے جمشید جی اور ان کے گھر کے لوگ بھی پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔'' ڈاکٹر دوبے نے مدن سے کہا اور ڈاکٹر مدن ایلورا کے ذکر پر چونک کر کسی خیال میں کھو گیا۔

Akram Allahabadi

''اور بھئی، میں تو صرف اس لیے راضی ہوگیا ہوں کہ یہ مقام کئی ہزار سال پرانی تاریخ رکھتے ہیں۔یقیناً ان کے اطراف میں جو..''

''گرگٹ ملیں گے،وہ بھی تاریخی حیثیت رکھتے ہوں گے۔''ڈاکٹر مدن نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تو پھر کیا طے کررہے ہیں آپ؟''کرن نے اس سے سوال کیا۔

''میرے لیے تو وہ کوئی ان دیکھے مقامات ہیں نہیں، مجھے تو معاف ہی رکھو۔''ڈاکٹر مدن نے معذرت طلب کی۔

''لیکن ابھی تو ویسے بھی تعطیلات ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔''مدن سوچنے لگا،لیکن میں ابھی یقینی طور پر وعدہ نہیں کرسکتا۔''

''تمہاری خوشی، ویسے سفر رہے گا دلچسپ۔جمشید جی کے گھر کے سب افراد، ہم لوگ...اور ہاں،مرزا جی اور چوبے جی بھی الٹی میٹم دے چکے ہیں کہ اگر پروگرام بنا تو وہ دعوت نہ دیے جانے پر بھی زبردستی شامل ہوپڑیں گے۔''

''پارٹی کافی دلچسپ ہے،لیکن مجھے دیکھے بھالے مقامات کی دوبارہ شیر سے کوئی لطف نہیں آئے گا۔''

''خیر،کوئی بات نہیں۔''ڈاکٹر دوبے نے کہا۔

''چلیے نا آپ بھی۔آخر آپ مردم بیزار کیوں ہوئے جارہے ہیں۔''کرن نے ڈاکٹر مدن سے خود اصرار کیا۔

''تم اسے مردم بیزاری سمجھتی ہو اور میں تضیع اوقات سمجھتا ہوں،بس اتنا ہی فرق ہے۔''ڈاکٹر مدن نے سنجیدگی سے کہا اور کرن کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی چھا گئی۔شاید اسے اس جواب سے تکلیف پہنچی تھی۔

ڈاکٹر مدن چائے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ڈاکٹر دوبے اسے خود دروازے تک

Akram Allahabadi

چھوڑنے آیا، مگر اس بار کرن دور ہی کھڑی رہی۔ وہ اسے جاتے ہوئے ضرور دیکھ رہی تھی، مگر اس کے چہرے پر ایک اداسی سی چھائی رہی۔ شاید اسے ڈاکٹر مدن سے ایسے جواب کی توقع نہ تھی، یا پھر وہ اس کی فطرت کو ہی نہ سمجھ سکی تھی۔ وہ ایک سادہ مزاج اور صاف گو آدمی تھا اور جو چیز اسے پسند نہ ہوتی اس کے لیے انکار کرنے میں وہ کبھی مروت سے کام نہ لیتا تھا، حالانکہ خود ڈاکٹر مدن کا چہرہ اس وقت ہر قسم کے جذبات سے خالی تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بشاش اور لاپرواہ نظر آرہا تھا۔ آج کرن نے جو کچھ شرارت کی تھی خود اس کا ردِعمل کرن پر کچھ بھی ہوا ہو، مگر ڈاکٹر مدن نے تو اسے ایک بچکانہ شرارت سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اور اس کے بارے میں وہ یہ سوچ بھی نہ سکا تھا کہ الو کی تصویر کے نیچے لکھے ہوئے مصرعہ اولیٰ کے یہ نیچے اس نے جو مصرعہ ثانی لکھ دیا تھا اس کا مفہوم کچھ اور بھی لیا جا سکتا ہے۔ ایک خوبصورت جوان لڑکی اس سے کسی غلط فہمی میں بھی مبتلا ہو سکتی ہے۔ اس نے تو صرف الو کے حسن کی طرف اشارہ کیا تھا، محض ازراہِ مذاق۔ اور یہ حقیقت تھی کہ اس کے مصرعہ ثانی کا ردِعمل کرن پر کچھ اور ہی ہوا تھا۔ شاید اسی لیے وہ اس ملاقات میں اس قدر شوخی سے پیش آئی تھی، مگر سمجھا اپنی اپنی۔ وہ اس کے لیے خود کو ذمے دار کیوں محسوس کرتا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ وہ ذہنی طور پر ایسے خیالات کے لیے کورا واقع ہوا تھا۔ اس نے نوکر سے تو صرف کرن کی شرارت کا جواب بھیج دیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

# قیامت

مغرب میں دور تک پھیلتے گئے چٹانوں کے سلسلے اور مشرق میں سر بفلک پہاڑوں کے درمیان ایک خوبصورت شہر بسا ہوا تھا، جس کے لوگ تنومند، خوبصورت، مگر سانولی رنگت کے تھے۔ان کے مکان کچی پکی اینٹوں کے بڑے بڑے گھروندوں کی طرح ان چٹانوں پر اور پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے تھے۔ان کی ساخت ایسی تھی جیسے آدمی زیادہ مدت نہیں گزری جب مکان بنا کر رہنا سیکھا ہے۔مگر زیادہ تر مکان پتھروں کے تھے، جن میں سے صرف چند باستون اور بلند تھے۔ چٹانوں کے شمال اور جنوبی ڈھلوانوں کے بعد سبز میدان تھے، جن میں کھیتوں کے ٹکڑے بھی تھے اور خود رو گھاس کے خطے بھی، مویشیوں کے ریوڑ کہیں کہیں چرتے نظر آرہے تھے۔حالانکہ آسمان ابر آلود ہونے کی وجہ سے ابھی سے شام ہوتی معلوم ہوتی تھی، نہ جانے کیوں آج آسمان پر مغرب کی طرف چھایا ہوا ابر بھی جھلکے ہوئے خون کی طرح سرخ ہو رہا تھا، جیسے پگھلے ہوئے تانبے کی تہیں جما کر رکھ دی گئی ہوں۔شہر میں باقاعدہ سڑکیں تھیں اور کہیں کہیں اونچائیوں پر کچھ عجیب ساخت کے مندر بنے نظر آرہے تھے۔یہ چوکور تھے اور ان کی چھتیں باہر سے چپٹی اور کارنس دار تھیں۔ یہ آبادی دور تک پھیلی چلی گئی تھی اور ایک مصروف شہر کا نقشہ پیش کرتی تھی، جہاں پتھریلی سڑکیں بھی تھیں اور تنگ وفراخ گلیاں بھی۔ البتہ بازار کھلے میدانوں میں ہی لگتے ہونگے، کیونکہ ایسی دکانیں نظر آرہی تھیں جو محض ایک ٹوکری، ایک غالیچے، یا چند اشیاء کے ایک ڈھیر پر مشتمل ہوں، البتہ ان دکانوں پر کوئی انسان نظر نہیں نظر آرہا تھا، کیونکہ تمام سڑکوں اور گلیوں سے گھنٹوں اور ناقوسوں کی گونج سنائی دے رہی تھی اور ہر مکان، ہر گلی، ہر سڑک سے جوق در جوق عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان تیزی سے چل کر کسی نہ کسی مندر کی طرف جارہے تھے۔ان کے چہروں پر خوف ویاسیت کے آثار نمایاں تھے۔خدا

جانے ایسی کونسی آفت اس شہر پر آنے والی تھی جس نے انھیں حواس باختہ کر دیا تھا۔

ان کے لباس بھی عجیب تھے۔جسموں پر کمر سے نیچے ادھ کھلی ٹانگوں تک صرف موٹے موٹے میلے اور رنگین کپڑوں کی دھوتیاں لپٹی ہوئی تھیں۔کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے زرد چادروں سے اپنا اوپر کا بدن چھپا رکھا تھا۔ان کے سر کدّو کی طرح صاف اور گھٹے ہوئے نظر آرہے تھے۔کچھ کے چہروں پر مونچھیں اور ڈاڑھیاں تھیں اور کچھ دونوں سے بے نیاز تھے۔ البتہ عورتیں چھاتیاں اور کمر سے پنڈلیوں تک کا بدن قدرے نفیس قسم کے کپڑوں سے ڈھانکے ہوئے تھیں۔بعض کی کمر سے پلّے لٹک رہے تھے۔ان کے بازوؤں پر جوشن اور ہاتھوں میں موٹے گول کنگن تھے جو کسی پیلی دھات کے بنے ہوئے تھے۔کانوں میں بالے تھے جو یا تو ہاتھی دانت کے ہونگے یا کوئی ایسی ہی سفید سی چیز کے۔ان کے بچے یا تو بالکل ہی ننگے تھے یا ذرا ذرا سی چندھیاں لپیٹے ہوئے۔مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ سڈول جسم والی اور خوبصورت تھیں۔اور بعض کے رنگ تو کھلے ہوئے تھے۔ان میں شادی شدہ بھی تھیں، جنھیں اپنا سینہ ڈھانکنے کی چنداں پرواہ نہ تھی۔مندروں پر بھیڑ جمع ہوتی جارہی تھی اور ناقوسوں اور گھنٹوں کی آواز تیز ہوتی جارہی تھیں۔

آبادی کے سرے پر چٹانوں کے ایک اونچے سلسلے پر ایک پتھر کا لمبا سا یک منزلہ مکان تھا جو شاید یہاں کے راجہ کا محل تھا، کیونکہ اس میں بہت سے دروازے اور کھڑکیاں تھیں اور سامنے ایک احاطہ کھنچا ہوا تھا۔

ان اونچی چٹانوں پر جہاں مندر تھے، کھڑے ہو کر شہر کا پورا نقشہ نظر آ سکتا تھا، مگر چند مقامات اور زیادہ اونچائی پر واقع تھے اور ان میں سے خصوصیت کے ساتھ وہ ٹیکرہ جس پر دائرے کی شکل میں سیڑھیاں چاروں طرف سے بلند ہوتی چلی گئی تھیں اور اوپر بیچ کے ایک چبوترے پر ختم ہوئی تھیں۔اس چبوترے پر ایک تقریباً چالیس فٹ اونچا پتھر کا بت رکھا ہوا تھا۔ یہ شاید وشنو کا بت تھا، جس کو سنگتراشوں نے بڑی عرق ریزی سے تراشا ہوگا، کیونکہ اسے جو نچز

دیے گئے تھے وہ بڑے فنکارانہ اور قرین حقیقت تھے۔شہر کے ہر کونے اور چٹانوں اور پہاڑوں سے بھی یہ بڑا چبوترہ اور وشنو کا دیو پیکر بت صاف نظر آ رہا تھا۔

لوگ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے، مگر انداز ایسا تھا کہ گڑگڑا رہے ہوں۔ مندروں کے دروازوں پر بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔شہر کے پیچھے پہاڑ کے دامن میں کھدائیں کاٹ کر اس مہان کلا کے مندر قائم کیے گئے تھے جو وہم و یقین کی مذہبی تقدیس کے باوجود عظیم فنکاروں کے معراجِ کمال کے مظہر تھے۔یہ کھدائیں بھی جو آبادی کا ہی ایک حصہ اور مندروں میں زیادہ افضل سمجھی جاتی تھیں، اس وقت پجاریوں اور معتقدین سے بھرپور تھیں۔ان میں علیحدہ علیحدہ بڑے خوبصورتی سے تراشے گئے دیوی دیوتاؤں کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔لوگ ان کے درشن کے لیے آج ہمیشہ سے زیادہ خواہاں اور مستعد نظر آ رہے تھے، کیونکہ ایک انجانی آفت اس شہر پر آنے والی تھی۔کم از کم یہاں کے باشندے تو یہی سمجھتے، کیونکہ برسوں سے بعد آج پھر آسمان کا رنگ سرخ تھا۔ایسا سرخ جسے دیکھ کر ہی ایک نامعلوم سا خوف دل و دماغ پر طاری ہونے لگتا، جیسے بادلوں میں کسی نے خون کے تھکلے جما دیے ہوں۔

اچانک نفیری کی کان پھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔اور اس کے ساتھ ہی راجا کے محل سے برہنہ پا راجا کی سواری نکلی۔وہ خود بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔اس کے ہمراہ بہت سے ایسے لوگ تھے جنہوں نے ان دھوتی نما رنگ برنگے تہ بندوں کے اوپر کسی درخت کی چھال کے رنگین پٹے باندھ رکھے تھے۔ان کے بازوؤں پر جوشن تھے اور سروں کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ان میں سے بعض کے کندھوں پر ترکش اور کمان لٹکے ہوئے تھے اور بعض کے ہاتھوں میں بھالے تھے۔ان سب کی نگاہیں ان سرخ بادلوں پر جمی ہوئی تھیں۔چار نفیری بجانے والے آگے آگے چل رہے تھے۔راجا کو دیکھتے ہی لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر چلانے لگے۔اس کے بعد ہر طرف سے ان کے ہجوم راجا کے جلوس کے پیچھے چل پڑے۔

راجا کا جلوس پا پیادہ ہی وشنو کے اس معبد کی طرف جا رہا تھا جو اونچائی پر گول

سیڑھیوں والے بڑے چبوترے پر ایستادہ تھا اور جس کے سر پر صرف چار لمبے اونچے سنگین ستونوں پر ایک سائبان یا چھت کھڑی ہوئی تھی۔ وشنو کے بت کے چبوترے کی گول سیڑھیوں کے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ ناقوسوں کا شور کان پھاڑنے لگا اور وہ سب سے بڑا گھنٹہ جو وشنو کے دیو پیکر بت کے اوپر اونچی چھت سے لٹکا ہوا تھا، اور جس کی رسی کا سرا سیڑھیوں سے ہوتا ہوا نیچے تک آیا تھا، بھاری گونج کے ساتھ بجنے لگا۔ وشنو کی پوجا کے اس گھنٹے کو کسی بڑے سنکھٹ یا کال کے وقت بجایا جاتا ہوگا اور اسے راجا خود رسی کھینچ کر بجا رہا تھا۔ اس گھنٹے کی بھاری گونج پہاڑوں تک سے جا ٹکراتی تھی اور میدانوں میں دور تک پھیل جاتی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی دوسرے مندروں اور گفاؤں والے مندروں سے جوق در جوق آدمی نکل کر وشنو استھان کی طرف دوڑنے لگ گھنٹے کی آواز جتنی تیز ہوتی جاتی تھی، لوگوں کے بھاگتے قدم بھی اتنے ہی تیز ہوتے جاتے تھے۔

اچانک بلند چھت والے ایک پتھر کے مکان کے سامنے پہنچ کر کچھ لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر چیخنے لگے۔

"دیوکنیا، پوجا کا سمے ہوگیا ہے۔ راجن راہ دیکھ رہے ہیں۔ گگن اور لال ہوتا جا رہا ہے۔ دیوکنیا، باہر آؤ۔ شہر پر سنکھٹ آ رہا ہے۔ وشنو کے کرودھ کو شانت کرو۔"

ان کی آوازیں اچانک گھنگھروؤں کی جھنکار کے ساتھ رک گئیں۔ وہ پیچھے ہٹنے لگے۔ اور پھر اس پتھریلی مکان کے بڑے در میں گھنگھروؤں کی رسیلی جھنکار گونجنے لگی، جیسے کوئی باہر آ رہا تھا۔ چھن... چھن... چھن...

وہ ایک شعلۂ جوالہ تھی۔ ایک جیتی جاگتی قیامت۔ شفاف گورا بدن۔ اس پر کاسنی رنگ کا باریک لباس۔ کمرے سے ایک جڑاؤ پٹکا لٹکا ہوا تھا اور بازوؤں اور کلائیوں پر سونے کے جڑاؤ جوشن اور کلائی بند بندھے ہوئے تھے۔ اس کے بال پیچھے سے جوڑے کی شکل میں بندھے تھے اور اس جوڑے پر سنہری روپہلی پھولوں کا ایک تاج تھا۔ چست سرخ انگیا پر

باریک باریک سرخ ستارے چمک رہے تھے اور ایک ململ سا باریک آسمانی دوپٹہ اس کے دوش پر ہو کر پیچھے لہرا رہا تھا۔ اس کے گورے گورے خوبصورت پیروں میں گھنگھرو چمک رہے تھے اور اس کا اندازِ خرام اتنا پرکشش تھا کہ آدمی بس دیکھتا رہ جائے۔ کمان دار ابروؤں کے نیچے اس کی گھنیری پلکوں والی خوبصورت آنکھوں میں ایک جادو تھا جو دیکھنے والے کو مسحور کر دیتا تھا۔ اس کے ہونٹ پتلے گلابی اور مسکراتے ہوئے تھے۔ چلتے وقت وہ ایک ہاتھ کی چٹکی سے اپنے ریشمیں لہنگے کا سرا تھام کر اسے اونچا اٹھا لیتی تھی جس سے اس کا بڑھتا ہوا پیر پنڈلی سے اوپر تک عریاں ہو جاتا تھا اور اس کا جسم اتنا گداز اور سڈول تھا کہ اگر وہ وشنو کی بڑی پجارن اور دیوکنیا نہ ہوتی تو شاید لوگ اس کے حسن و شباب کے قصیدے پڑھتے پھرتے۔ وہ جب اپنا پیر اٹھاتی تو پچھلے پیر کی ایڑی ایک خاص عمودی انداز میں اٹھ جاتی۔ وہ جب اگلا پیر زمین پر ٹیکتی تو پہلے پنجہ زمین پر ٹکتا اور پھر ایک خاص انداز میں پوری ایڑی۔ بڑا دلکش اندازِ خرام تھا اس کا۔ ڈاکٹر مدن اسے دیکھتے ہی حیرت سے اچھل پڑا۔ وہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اس مجسمے اور اس چلتی پھرتی حیات میں سرمو فرق نہ تھا۔ وہی چہرہ اور اس کے نقوش، وہی اعضا کا تناسب، وہی اندازِ خرام، وہی لباس، وہی سحر انگیز آنکھیں۔ ڈاکٹر نے چاہا کہ اسے کسی نام سے پکارے، مگر حلق سے آواز نہ نکل سکی، کیونکہ اس وقت وہ بات ہوئی جس کا خطرہ پورے شہر کو تھا، اور جس کے لیے دیوتاؤں کی پوجا کے گھنٹے اور ناقوس بج رہے تھے۔ لوگ پہلے ہی آسمان کی اس خوں آشام سرخی سے ڈر رہے تھے اور ان کا اندیشہ صحیح نکلا۔ اچانک مشرق میں کھڑے ہوئے پہاڑ کی طرف سے گڑگڑاہٹ کی ایک خوفناک آواز سنائی دی اور پھر زمین لرزنے لگی۔ سارا شہر لرزنے لگا۔ ہزاروں بھیانک اور خوفزدہ چیخیں بلند ہوئیں اور لوگ بے تحاشا ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ایک پل میں یہ آباد اور پرسکون شہر قیامتِ صغریٰ کا منظر پیش کرنے لگا۔ وشنو کے بت کی سیڑھیوں کو گھیرے ہوئے لوگ پہلے تو ہاتھ اٹھا اٹھا کر چلائے، مگر جب راجا کے ہاتھوں سے بڑے گھنٹے کی رسی بھی چھوٹ گئی تو وہ بھی گھبرا کر بھاگنے لگے۔ کیونکہ پہاڑ کی گھڑگھڑاہٹ بڑھتی جا رہی تھی اور

زلزلہ بڑھتا جا رہا تھا۔اور پھر مکانات منہدم ہونے لگے۔زمین جگہ جگہ سے پھٹنے لگی اور چٹانیں وڑ کنے لگیں۔بہت سے بھاگتے لوگ ان وڑوں میں سما گئے۔بہت سی پھٹی ہوئی زمین کے خلاء میں جا گرے اور اونچے ستونوں والے پتھر کے مکانوں کے ستون تو چھتوں سمیت زمین پر لیٹنے لگے۔پرجا کو راجا کا ہوش نہ تھا، نہ راجا کو پرجا کا۔ہر ایک اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا، لیکن یہ کوئی نہ سوچتا تھا کہ بھاگ کے جائیں گے کہاں۔

ڈاکٹر کا دل یہ منظر دیکھ کر کانپنے لگا تھا۔وہ اس قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اکیلی ہی اسی پرسکون انداز میں شیو کے مندر کی طرف چلی آ رہی تھی۔چھن...چھن...چھن...اس کے خوبصورت پیروں کے گھنگھروؤں کی جھنکار ڈاکٹر کے کانوں میں گونج رہی تھی اور وہ بت بنا کھڑا تھا۔وہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی، سوائے اس مجسمے والے وجود کے۔اس کے بڑھتے قدم ڈاکٹر کو اپنے سینے پر پڑتے محسوس ہو رہے تھے۔اور اس کی نگاہیں خود بخود اس حسین مقدس وجود کے راستے میں بچھتی جا رہی تھیں۔

اچانک پہاڑ نے اپنا منہ کھول دیا۔آتش فشاں کے پھٹتے ہی بڑی زور کی گھڑگھڑاہٹ ہوئی اور زلزلے نے اور خوفناک شکل اختیار کر لی۔پھر آتش فشاں کی چوٹی سے شعلے نکلنے لگے، جنھوں نے پورے شہر کو سرخ روشنی کے عکس میں نہلا دیا۔دھوئیں کے بادل آتش فشاں پہاڑ کی چوٹی سے بلند ہو کر آسمان کو ڈھانک رہے تھے اور پھر آتش فشاں کے دہانے سے چٹانیں اڑنے لگیں۔بڑی بڑی چٹانیں۔پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے جو دور سے خس و خاشاک کی طرح منتشر ہوتے نظر آ رہے تھے۔

کچھ دیر پہلے کا آباد پرسکون شہر کھنڈرات کا ڈھیر نظر آنے لگا اور دور تک لاشیں ہی لاشیں، جن میں سے بہت سی زمین کے دروں میں دھنسی ہوئی تھیں، بہت سی درکی ہوئی چٹانوں میں پھنس گئی تھیں اور بعض لوگ گر گر کر اٹھتے ہوئے بھاگنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

ڈاکٹر کی حیران نظریں اس حسین رقاصہ کے پیروں پر ہی جمی ہوئی تھیں۔وہ اب

وشنو کے بت کی سیڑھیوں تک پہنچ چکی تھی ۔پھر وہ آہستہ آہستہ اور پرسکون انداز میں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہر سیڑھی پر گھنگھروؤں کی جھنکار بلند ہوکر اس قیامت سنگریٰ کے شور میں مدغم ہوجاتی ۔اس کی نگاہیں وشنو کی مورتی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ سحرزدہ انداز میں اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اچانک ڈاکٹر چونک پڑا۔ لاوے سے نکلا ہوا کسی چٹان کا ایک ٹکڑا اڑتا ہوا اسی طرف آرہا تھا ۔وشنو کے مندر کی سیڑھیوں کی طرف ۔

''بچو...''ڈاکٹر بے اختیار چیخ اٹھا۔

اس نے دیکھا،اس نے ڈاکٹر کی آواز سن کر ایک بار پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور ڈاکٹر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، کیونکہ اب اس کا چہرہ اسے اور صاف نظر آیا تھا۔بالکل وہی اور کتنا حسین ۔مگر صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر اس نے پھر رخ پھیر لیا اور اسی پرسکون انداز میں سیڑھیاں چڑھنے لگی، جیسے اسے اس عظیم تباہی سے نہ کوئی خوف محسوس ہو رہا ہو نہ اس کی پرواہ ہو۔

اور ڈاکٹر نے دیکھا کہ اڑتی ہوئی چٹان کا وہ ٹکڑا اس کے سر پر سے ہوکر نکل گیا اور سیڑھیوں کے پاس جا کر گرا،اس نے کچھ نچلی سیڑھیاں توڑ ڈالیں اور وہ زمین میں دھنس گیا۔

وہ اب سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ کر رک گئی۔اس نے ایک بار پھر پلٹ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور پھر دیوتا کی طرف گھوم کر اس چبوترے پر چڑھ گئی جس پر وشنو کی تقریباً چالیس فٹ بلند شبیہ ایک ابدی سکون کے ساتھ پتھر کے جسم میں ڈھلی موجود تھی۔

پیر کے گھنگھروؤں کی جھنکار پھر سنائی دی اور اس نے وشنو کے سامنے ایک پیر آگے کر کے بڑے دلفریب انداز میں جھک کر پرنام کرتے ہوئے والہانی انداز میں اپنا رقص شروع کر دیا۔

''چھن چھن... چھنانن چھن...چھن...چھن... چھنانن چھنانن... چھنانن...چھن

چھن چھن...چھن چھن..."

ڈاکٹر اس والہانی رقص میں خود بھی ایسا کھو گیا کہ اسے تباہ ہوتے ہوئے اس شہر اور آتش فشاں کی تباہ کاری کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ جب تک رقص کرتی رہی وہ کھوئے ہوئے انداز میں اسے دیکھتا رہا چٹانیں اڑتی رہیں، زمین ہلتی رہی اور آتش فشاں سے لاوے کی موٹی چادر بہہ کر آبادی کے رہے سہے کھنڈرات اور بکھری ہوئی لاشوں پر سے گزرنے لگی، مگر اس نے یہ سب کچھ نہ دیکھا، یہاں تک کہ ایک بار وہ ناچتے ناچتے زمین پر دوزانو ہو کر وشنو کے سامنے جھکی اور پھر سر زمین پر ٹیکتے ہوئے اسی طرح رہ گئی۔

ڈاکٹر کا دل کانپ اٹھا۔ زلزلے کے ایک خوفناک جھٹکے سے اس مندر کے ستون اور خود دیوتا کی مورتی بھی لرزنے لگی تھی۔ پھر ہوا کا ایک جھکڑ چلا اور پتے اور دھول زمین بوس رقاصہ پر بکھرتا ہوا نکل گیا۔ اچانک ایک اڑتی ہوئی چٹان آ کر وشنو مندر کی چھت پر گری اور اس کے ساتھ ہی چھت نیچے بیٹھنے لگی۔ ایک ستون ٹوٹ کر گر پڑا اور چھت کا ایک کونہ چبوترے پر آ گرا۔

ڈاکٹر نے دیکھا شکستہ ہونے والی چھت سے مٹی اور ملبہ اس زمین بوس رقاصہ کے جسم پر گرتا گیا، یہاں تک کہ وہ صرف مٹی اور ملبے کا ایک ڈھیر نظر آنے لگا۔ اسے بچا لینے کے خبط میں وشنو مندر کی طرف دوڑتے ہوئے آخری بار ڈاکٹر صرف اتنا دیکھ سکا کہ اس کے حسین چہرے پر اس وقت ایک جلال، ایک نور اور ایک ابدی اور پر وقار سکون برس رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی سوئی ہے۔ اور پھر وہ حسین چہرہ بھی اس کی نظروں سے چھپ گیا۔ ڈاکٹر کے قدم اچانک رک گئے اور خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اڑتی ہوئی ایک چٹان اس کے اوپر ہی آ رہی تھی۔ اس کے قدم سیڑھیوں سے ٹکرائے، وہ گرا اور پھر اوپر آتی ہوئی چٹان سے بچنے کی کوشش میں جیسے ہی اس نے بے ساختہ تیزی سے کروٹ لی..تو دینو کے ہاتھ سے چائے کی ٹرے چھوٹ گئی۔

ڈاکٹر نے چینی کے برتن ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ۔دینو برتنوں کو چھوڑ کر گھبرایا ہوا اب اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا ہوا، صاحب، آپ کو؟ طبیعت کیسی ہے، صاب؟''

''آں... مجھے... کچھ تو نہیں... کیا ہوا تھا مجھے؟''

''صاب، رات سے آپ اسی آرام کرسی پر سو رہے ہیں اور ابھی ابھی لیٹے لیٹے کروٹ لے کر لڑھک پڑے تھے۔''نوکر نے بتایا۔

''اوہ، کچھ نہیں... کچھ نہیں... میں نے بستر سمجھ کر کروٹ بدلی ہوگی۔''ڈاکٹر نے جھوٹ بولا۔

''صاب، آپ کو گرتے دیکھ کر گھبراہٹ میں میرے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ گئی۔'' نوکر نے ڈرتے ڈرتے اشارے سے بتایا۔

''تو دوسرا سیٹ نکلوالو، روتے کیوں ہو۔''ڈاکٹر مسکرا دیا۔

نوکر کے چہرے سے پریشانی دور ہوگئی، ورنہ وہ تو سمجھا تھا کہ کم سے کم ڈانٹیں تو سننے کو ملیں گی ہی۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

# سفر

مدراس میل کے ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ڈاکٹر دوبے، ڈاکٹر مدن، کرن، مرزا ی، چوبے جی اور ڈاکٹر دوبے کا پارسی دوست جمشید جی جہانگیر اور اس کی لڑکی پروین ایک ساتھ سفر کر رہے تھے۔

مگر نہ جانے کس کمبخت نے اس کرسچین لیڈی کو بھی اس کمپارٹمنٹ میں بیٹھنے کا مشورہ دیا تھا جو ڈاکٹر مدن کے لیے دردِ سر بنی ہوئی تھی۔ ایک گجراتی بھی تھا جو دائیں بازو بیٹھا ہوا ایک گجراتی اخبار کی ایک ایک سطر چاٹ رہا تھا۔ عیسائی خاتون سے کیونکہ کوئی مخاطب نہیں تھا، اس لیے وہ اپنے اس طوطے سے ہی باتیں کر رہی تھی جسے وہ ایک پنجرے میں اپنے ساتھ لے کر سفر کر رہی تھی۔ وہ اس کا پالتو تھا۔ اور کبھی کبھی تو وہ اس زور سے ٹیں ٹیں شروع کر دیتا کہ ڈاکٹر کو اپنے داہنے کان میں انگلی دے لینی پڑتی۔ مرزا جی اور چوبے جی میں کچھ نوک جھونک ہو رہی تھی، جسے ڈاکٹر دوبے، جمشید جی اور ان کی لڑکی بہت ہی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ البتہ کرن خاموشی سے بیٹھی تھی۔ کبھی وہ ڈاکٹر مدن کی طرف دیکھنے لگتی، کبھی ان لوگوں کی طرف۔

ڈاکٹر مدن نے ایلورا جانے کا پروگرام اچانک ہی بنایا تھا۔ وہ ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے اپنے ماحول سے فرار حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس خواب کے بعد جو نہ جانے خواب تھا یا چھٹے حواس کی ایک کیفیت، وہ اور بے سکون ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے تو وہ مجسمہ اور اس کے ذہن پر حاوی ہو گیا تھا۔ وہ اتنا عقل مند ضرور تھا کہ خواب جیسی چیزوں کو کوئی اہمیت نہ دے اور اس لیے اس نے اسے ذہن سے ہٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی تھی، مگر وہ حسین وجود اس سے بھلایا نہ جا سکا تھا، جو اسے عالمِ خواب میں زندہ اور متحرک نظر آیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کسی عورت کو پیار کرے، مگر وہ عورت کون ہو سکتی تھی، یہ بھی وہ نہ

جانتا تھا۔کرن تو اس کے سامنے تھی اور خود بھی اس کی طرف جھک رہی تھی ۔مگر ایسی جانی پہچانی شکلوں میں سے کوئی کشش نہ محسوس ہوتی تھی ۔پارسی کی لڑکی پروین رنگ میں سفید اور نقوش میں سبک اور خوب رو تھی، مگر وہ بھی اسے من بھاتی نہیں معلوم ہوئی ۔خدا جانے کون سا چور تھا اس کے دل میں، وہ ایک انجانے وجود کے لیے ہی اپنے جذبات میں ایک تغیر محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ چاہتا تھا کہ کوئی کہیں بھٹکتا ہوا اسے مل جائے ۔کون؟ اور کہاں؟ یہ وہ خود نہ سمجھ پایا تھا۔ بس ایک عجیب سی کیفیت ۔اس کے باوجود کہ اس نے اس ذہنی الجھن سے فرار حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر دوبے کی ٹو رنگ پارٹی میں شامل ہونا منظور کر لیا تھا ۔اس کا ذہن بلا واسطہ طور پر ان ہی خیالات میں الجھا ہوا تھا اور عیسائی خاتون کے طوطے کی ٹیں ٹیں اس میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے مختصر سے انٹرول کی کیفیت پیدا کر دیتی ۔بالآخر اس سے نہ رہا گیا ۔وہ اس عورت سے مخاطب ہو گیا۔

''میڈم، کیا آپ اپنے طوطے کو خاموش رہنے کی ہدایت نہیں کر سکتیں؟''

''بیٹی بہت شریر ہے ۔میرا کہا نہیں مانتا ہے۔''عیسائی خاتون نے بڑے پیار سے طوطے کی طرف دیکھ کر جواب دیا ۔ڈاکٹر مدن نے لاجواب ہو کر منہ پھیر لیا اور شاید طوطے کو بھی اسی وقت پھر شرارت سوجھی ۔وہ چیخنے لگا ۔

''نہیں، بیٹی ۔ بیٹے ، خاموش رہو۔ ہمارے ہمسفر کو تمہاری باتیں ناگوار گزرتی ہیں۔''

''ڈونے دو...ٹیچ ...''طوطے نے پھڑ پھڑا کر کہا۔

''نہیں، بیٹے ۔ہمیں اچھے شہریوں کی طرح دوسروں کی تکلیف کا خیال رکھنا چاہیے۔''

''نہیں رکھتا۔''طوطے نے جواب دیا۔ڈاکٹر مدن چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔اب گجراتی بھی یہ تماشا دیکھنے لگا تھا۔

''پوپٹ بولتو چھے۔''اس نے طوطے کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ یس، پہاڑی طوطا ہے۔ میں نے ستر روپے میں خریدا تھا اسے۔'' عیسائی خاتون نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔''طوطے نے تصدیق کی۔

''یہ طوطا تقدیر کا حال بھی بتاتا ہے۔''بوڑھی عیسائی خاتون نے بتایا۔

''تب تو ریس کے گھوڑے بھی بتاتا ہوگا؟'' گجراتی سوچ کر بولا۔

''پوچھ کر دیکھو۔''

''اچھا، پوپٹ، ہم پچھلی ریس میں کون کون سا گھوڑا جیتے تھے؟''

''ٹین چار۔''طوطے نے ہانک لگائی۔

''بالکل سچ۔ تین اور چار نمبر کے گھوڑے میں جیتا تھا۔ ارے واہ، یہ تو...'' گجراتی نے کہنا چاہا۔

''کوئی پہنچا ہوا فقیر معلوم ہوتا ہے۔''مرزا جی جلدی سے بول پڑے۔ انھوں نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔

''وہاٹ...؟'' کرسچین خاتون نے مرزا ی کی طرف پلٹ کر غصے سے پوچھا۔

''ہندوستانی میں بات کیجیے، محترمہ۔ وہ زمانے لد گئے جب بات بات میں فرنگیوں کی نقل کی جاتی تھی۔''مرزا جی نے بھی چڑ کر جواب دیا۔''کیوں، چوبے جی؟''انھوں نے چوبے جی سے بھی تصدیق چاہی۔

''اور نہیں تو کیا، کوا چلا ہنس کی چال... ہونہہ... اسی گٹ پٹ گٹ پٹ گٹ پٹ نے سارے دیس کا ستیاناس مار رکھا ہے۔''

''کرسچین خاتون کی سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آئیں۔ مگر وہ ان کے اندازِ گفتگو سے ان کی مخالفانہ روّیہ کو سمجھ گئی۔ اس کی بھنویں تن گئیں۔

Akram Allahabadi

''نان سنس۔'' وہ بڑبڑائی۔جس کا مطلب مرزا جی بھی نہ سمجھ سکے۔انھوں نے ڈاکٹر مدن سے پوچھا۔

''یہ محترمہ کیا فرما رہی ہیں؟''

''کہہ رہی ہیں،آپ عجیب چغد واقع ہوئے ہیں۔''

''جی، کیا فرمایا انھوں نے...چغد...؟چغد یہ خود بلکہ ان کی سات پشتیں۔''

''سات میری طرف سے بھی۔''چوبے جی بھی مرزا کا ساتھ دیے بغیر نہ رہے۔

کرچیئن خاتون ان کے الفاظ کا مطلب نہ سمجھی،اس لیے چپ ہی رہی۔جس پر مرزا نی کا غصہ اور تیز ہوگیا۔ڈاکٹر دوبے،مدن اور کرن ان کی اس کیفیت سے لطف لے رہے تھے۔

''میڈم،یعنی خاتون،آپ نے کیا سمجھ کے کہا مجھے چغد؟''مرزا جی براہِ راست اس سے مخاطب ہو گئے۔

''ارے جانے دو نا،میاں صاب۔کائے کو بیچاری بوڑھی عورت سے لڑتے ہو۔'' گجراتی نے انھیں سمجھانا چاہا۔

''یعنی کہ ہم لڑتے ہیں۔واللہ،آپ کی آنکھوں میں ضرور کچھ فتور ہے۔اور یہ میاں صاب کس کو فرمایا آپ نے؟ آپ خود ہوں گے میاں صاب۔''مرزا جی گجراتی پر بگڑ گئے۔

''میں کائے کو،ما رو نا م تو جمنا داس چھے۔''

''سات بھی ہوتے تو کیا بگاڑ لیتے آپ۔''چوبے جی نے مرزا جی کی ہمدردی میں زبردستی اس سے بھڑ گئے۔

بیچارہ گجراتی گھبرا گیا۔وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔

''میں پوچھتا ہوں آپ نے مجھے میاں صاب فرمانے کی جرات کیسے کی۔''مرزا جی عیسائی عورت کو بھول کر اسی کے پیچھے پڑ گئے۔گجراتی کی گھبراہٹ قابلِ دید تھی۔

''تو آپ میاں صاحب نہیں ہو؟''اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''پھر وہی، واللہ، آپ آدمی ہیں یا پاجامہ۔''مرزا جی کا ٹمپریچر اور چڑھ گیا۔

''ماپھ کرنا، میں آپ کو مسلمان سمجھتا تھا۔''گجراتی نے معذرت کی۔

''یہ لیجیے۔یعنی آپ کو میری مسلمانی میں بھی شک ہونے لگا۔''مرزا جی نے چوبے کی طرف دیکھ کر کہا۔ڈاکٹر، کرن اور مدن کے لیے تو ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا اور وہ کرچیئن خاتون اپنا جھگڑا بھول کر ان کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔

''دیکھیے، مہاشے، میں بھی ہندو ہوں اور آپ تو بنیے معلوم ہوتے ہیں۔میں آپ سے بھی بہت اونچے خاندان کا ہندو ہوں، مگر میں اپنے مسلمان دوست، یعنی مرزا جی کی بے عزتی سہہ نہیں سکتا۔''چوبے جی نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور گجراتی کا خون آدھا خشک ہو گیا۔دل ہی دل میں وہ پچھتا رہا تھا کہ اس بوڑھی کرچیئن عورت کے معاملے میں زبان کھول کر وہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''مگر میں نے کب ان کی بے عزتی کھراب کی ہے، بھائی جی۔''

اس جملے پر تو مرزا جی بھی ہنس پڑے۔ان کا غصہ تو گجراتی کے ملتجیانہ لہجے سے ہی ختم ہو گیا تھا۔

''دراصل ان کے یہاں میاں صاحب بھیک مانگنے والے فقیروں کو کہتے ہیں۔''ڈاکٹر دوبے نے اس زبردستی کی لڑائی کو کلائمکس پر لانے کے بعد گجراتی کو بتایا۔

''ایسا...تو میرے کو ئیں مالوم تھا۔ماپھ کرنا، بھائی صاب۔''گجراتی نے مرزا جی سے معافی مانگ لی اور وہ موم پر گئے۔

''کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں، لیکن کچھ کہنے سے پہلے اس کا مطلب ضرور سمجھنا چاہیے۔''مرزا جی نے اسے سمجھایا۔

بات کرچیئن خاتون کے طوطے سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ویسے اگر

ڈاکٹر دوبے چاہتے تو اس جھگڑے کو ہوا دیتے دیتے کافی بڑھا سکتے تھے، کیونکہ مرزا جی اور چوبے جی دونوں ہی جلد غصے میں آجاتے تھے، البتہ وہ شائستگی کی حد سے کبھی نہیں گزرتے۔ جھگڑے کا مطلب ان کے نزدیک یہی تھا کہ زبانی طور پر طنز، تحقیر یا اظہارِ غضب سے کام لیا جائے۔

بہرحال صلح ہوجانے کے بعد ایک بار کمپارٹمنٹ میں پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ اور ڈاکٹر مدن کھڑکی سے باہر سر نکال کر اپنے خیالات کی رو میں کھو گیا۔ بوڑھی عورت کا طوطا اب بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے شور مچا رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے اب اپنے کان پتھر کے کر لیے تھے۔ دل ہی دل میں وہ ریلوے اسٹاف کو پُرزور سخت وسست کہہ رہا تھا، کیونکہ ان کی ہی غیر قانونی مروت سے پارسی لیڈی اپنے طوطے کو فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں بے ٹکٹ سفر کرا رہی تھیں۔ چوبے جی حکمت سے بھی کچھ دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے وہ تو سانڈے کے تیل سے متعلق ڈاکٹر دوبے کو لیکچر دینے اور لیکچر لینے لگے۔ مرزا جی نے معاملہ سوا دیکھا تو بلا تکلف ڈاکٹر مدن کے پاس آبیٹھے۔ اور عین اس وقت جب کرن ارادہ کر رہی تھی کہ ڈاکٹر مدن سے خود ہی سلسلۂ گفتگو چھیڑ دے۔ کیونکہ سانڈے کی تاریخی حیثیت پر ایک طرف ڈاکٹر دوبے کی بحث شروع تھی اور دوسری طرف چوبے جی اس کی خصوصیات گنا رہے تھے۔ کسی بھی تیسرے آدمی کے لیے وہاں بور ہونے کے سوا کیا تھا۔ اخلاقاً ڈاکٹر مدن مرزا جی سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ مجھے تو معاف ہی رکھیے۔ وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔

''ڈاکٹر صاحب، میں نے اکثر کتابوں میں بابل کے معلق باغات کے بارے میں پڑھا ہے، آپ تو جانتے ہوں گے یہ کیا بلا ہیں؟''

''بلا کیوں؟ باغات تھے۔''

''نہیں، میرا مطلب ہے کہ یعنی وہ معلق کیسے ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی تک ہے۔''

''یعنی کہ نہ زمین میں نہ آسمان میں؟'' مرزا جی نے پوچھا۔

Akram Allahabadi

''جی ہاں۔وہ شاید کسی جادوگر نے بنوائے تھے۔''

''مگر کیسے بنوائے ہوں گے؟ کیا درخت وغیرہ یوں ہی ہوا میں لٹکے ہوئے ہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ انھیں کسی بادل پر بنوایا گیا ہوگا۔''ڈاکٹر مدن نے سنجیدگی سے کہا۔وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح مرزا جی پیچھا چھوڑ دیں۔وہ اس ماحول میں تنہا رہنا چاہتا تھا تا کہ اس کے سوچتے رہنے کی فرصت میں کوئی خلل نہ واقع ہو،مگر مرزا جی کہیں آسانی سے ماننے والے تھے۔

''کمال ہے واقعی بادل پر باغات بھی بنوا دیے،تب تو وہ مکان بھی بنوا سکتا ہوگا؟''

کرن بھی شریک ہوگئی۔

''بادلوں پر؟ہا...کتنی زبردست بات ہوتی تو جو بادلوں پر مکانات بنا کرتے اور ہم آسمان پر اڑ کر ساری دنیا کی سیر کرتے۔''

''ہوائی جہاز کا سفر کیجیے،مرزا چچا۔''کرن دوسری نشست سے پھر بول اٹھی۔

''لاحول ولاقوۃ۔کیا نامعقول سواری ہے۔روز روز اخباروں میں خبریں آتی رہتی ہیں حادثوں کی۔''

''نہیں،ایک طریقہ اور بھی ہے۔''ڈاکٹر مدن نے کہا۔

'کیا؟''مرزا جی نے تعجب سے پوچھا۔

''امریکہ میں ایک سائنسدان نے اپنے تجربے سے انسان کو چیل کوؤں کی طرح اڑنے کے قابل بنا دیا ہے۔''

''کیا واقعی...؟ کیسے...؟''

''وہ شتر مرغ کے خون کے جوہر انجیکشن کے ذریعے انسان کے جسم میں داخل کر دیتا ہے اور پھر چند ہی دنوں میں حضرت انسان کے پر نکل آتے ہیں۔''ڈاکٹر مدن بتانے لگا۔

''چونچ بھی نکل آتی ہوگی؟''کرن نے درمیان میں دخل دے کر پوچھا۔اور ڈاکٹر

مدن کو رومال منہ پر رکھ لینا پڑا۔

''جب پر نکلیں گے تو چونچ کیوں نہ نکلے گی۔'' مرزا جی نے خود ہی جواب دے دیا۔

''تب پھر دم بھی نکلتی ہوگی؟'' کرن نے مزید وضاحت چاہی اور ڈاکٹر مدن کو ہنسی چھپانے کے لیے کھڑکی سے باہر سر نکال کر کھانسنا پڑا۔

''استغفر اللہ، یہ سائنسدان بھی جادوگر ہی ہوتے ہوں گے جو قدرت کے کاموں میں دخل دینے لگتے ہیں۔'' مرزا جی نے سائنسدانوں کی مذمت کی اور اس طرح بات کہیں سے کہیں پہنچا کر ڈاکٹر مدن نے بابل کے باغات والی بحث ہی کھٹائی میں ڈال دی۔ مرزا جی کی بھولنے کی عادت تھی۔ وہ بابل کے باغات کو بھول کر اس سائنسدان کے بارے میں سوچنے لگے، جو انسانوں کو انجیکشن سے شتر مرغ وغیرہ وغیرہ بنا سکتا ہوگا۔ پھر اپنے ایمان کو تر و تازہ کرنے کے لیے انھوں قدرے اونچی آواز میں اس نامعلوم سائنسدان پر دو چار بار لعنت بھیجی اور توبہ استغفار کی گردان رٹتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہ گئے۔ مثلاً یہی کہ کہیں اگر واقعی وہ شتر مرغ ہوتے کیسا رہتا۔ اس وقت انھیں یہ قطعی یاد نہیں آیا کہ بیچارہ شتر مرغ، مرغ ہی مرغ ہوتا ہے، آسمانوں کی سیر اس کی تقدیر میں کہاں۔

ڈاکٹر دوبے اور چوبے جی کی بحث اب سانڈے سے گزر کر مگرمچھوں تک آ گئی تھی اور چوبے جی اس سوال پر اڑے ہوئے تھے کہ اس جانور کو 'مگر' کیوں کہا گیا ہے۔ اگر، مگر بھی کوئی نام ہوئے بھلا۔ اور ڈاکٹر دوبے بڑی سنجیدگی سے انھیں بتا رہا تھا کہ کئی برس پہلے ایک بادشاہ نے اس جانور کو دیکھ کر کہا تھا کہ 'اگر یہ خشکی کا جانور ہوتا تو کتنا خوفناک ہوتا، مگرمچھ...''

وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ وزیر اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''مچھلی بھی نہیں ہے یہ، حضور۔ بس کچھ بیچ بیچ کی مخلوق ہے۔''

اور اسی بات پر اس کا نام مگرمچھ ہی پڑ گیا۔ یعنی مچھلی ہوتے ہوئے نصف ہو کر صرف 'مچھ' رہ گیا ہے۔ اب سمجھے آپ؟''

''تو یہ بات ہے۔''چوبے جی نے بالآخر اس وجہ تسمیہ پر صواد کرتے ہوئے سر ہلایا۔

گاڑی چلتی رہی، اسٹیشن گزرتے رہے اور ان کا سفر ایسی ہی دلچسپیوں میں کٹتا رہا۔صبح وہ اورنگ آباد پہنچنے والے تھے۔اور رات کیونکہ نصف سے تجاوز کر گئی تھی، اس لیے انھیں نیند کے جھونکے آنے لگے اور ایک ایک کر کے وہ بدمست شرابیوں کی طرح بیٹھے بیٹھے ہی جھومنے لگے۔عیسائی خاتون تو پہلے ہی اپنے طوطے کے پنجرے پر سر ٹیک کر سو گئی تھی اور طوطا دوسری طرف بیٹھے ہوئے گجراتی کی اونی شال کا ایک سرا اندر کھینچ کر اس پر اپنی چونچ تیز کر رہا تھا۔چوبے جی خراٹے بھرتے ہوئے سانڈوں کے جنگل میں پہنچ گئے۔اور مرزا جی چند منٹ بعد شتر مرغ بن کر بابل کے معلق باغات کی تلاش میں آسمان میں اڑنے لگے۔

''تمھیں نیند نہیں آ رہی ہے، کرن؟''ڈاکٹر مدن نے کرن سے پوچھا۔

''اور یہی سوال میں آپ سے کروں تو؟''کرن نے کہا۔

''اچھا تو ہم دونوں سونے کی کوشش کریں، ورنہ کل دن بھر نیند کے جھٹکے آئیں گے۔''ڈاکٹر نے پیر پھیلاتے ہوئے جماہی لے کر کہا۔

''مجھے سفر میں نیند نہیں آتی۔''کرن نے بتایا۔

''خواب آور گولیاں دوں، میرے پاس ہیں؟''

''جی نہیں۔''کرن نے برا سا منہ بنایا۔

''تمہاری مرضی۔اچھا، شب بخیر۔''یہ کہہ کر ڈاکٹر نے آنکھیں موند لیں اور کرن کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔وہ سمجھی تھی کہ ڈاکٹر اس سے کچھ باتیں کرے گا اور ممکن ہے کوئی ایسی بات بھی اس کی زبان تک آجائے جسے سننے کے لیے کرن کا دل کب سے آرزو کر رہا تھا۔کم از کم وہ اتنا ہی کہہ دیتا ہ اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اسے خوشی ہو رہی ہے، مگر وہ اپنے پتھر کے مجسموں سے کچھ مختلف نہیں نکلا۔

☆☆☆☆☆☆

بس کے ذریعے اورنگ آباد سے ایلورا پہنچنے میں انھیں بمشکل دو گھنٹے لگے۔ دنیا کے دوسرے تاریخی مقامات کی طرح یہاں سیاحوں کے لیے قیام وغیرہ کے کوئی انتظامات نہیں تھے، البتہ اورنگ آباد میں ہی انھیں ہوٹلوں میں ٹھہرنا پڑتا اور پھر یہاں سے بسوں پر وہ ایلورا جاتے۔ یہاں سے اجنٹا کے لیے بھی گاڑیاں ملتیں، لیکن ایلورہ کی نسبت اجنٹا یہاں سے زیادہ دور تھا، اولیے پہلے یہی طے رہا کہ ایلورا کی ہی سیر کی جائے۔ پارٹی نے اس سیاحت سے پورا لطف لینے کے لیے ہوٹلوں میں ٹھہرنے کی بجائے ایلورا کے نزدیک ہی ایک دیہاتی بستی میں ٹھہرنا گوارا کیا۔ شہر سے وہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں ایک پرائیوٹ ٹیکسی میں علیحدہ سے لیتے گئے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ کم از کم ایک ہفتہ اس ویران پر فضا مقام پر گزارا جائے۔ وہ یہاں کھلی آب وہوا اور تاریخی آثار کی سیر کے علاوہ دیہاتی زندگی کے پرسکون ماحول سے بھی پورا پورا لطف اٹھانا چاہتے تھے۔ شہر میں رہتے رہتے تو وہ ایسی زندگی کو ترس گئے تھے۔ شہر کے مصروف، تصنع آمیز اور ہنگامہ خیز ماحول کی بہ نسبت یہاں ہر طرف حسنِ فطرت کے نظارے بکھرے ہوئے تھے۔ ہر چیز قدرتی معلوم ہوتی تھی۔ دور تک لہلہاتے ہوئے کھیت، کھلے کھلے میدان اور ان میں کہیں کہیں سمٹی پھیلی ہوئی خود رو جھاڑیاں، بڑے چھوٹے درخت کسی افریقی میدان میں چرنے والی بارہ سنگھوں کی ریوڑ کی طرح بکھرے چلے گئے تھے۔ مشرق میں چوٹی دار پہاڑیاں، گلے بانوں کی طرح سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ شہر میں اگر بڑے بڑے آدمیوں کی اونچی عالیشان کوٹھیوں کا جلال برستا تھا تو یہاں قدرت کی حقیقی عظمت ذرے ذرے سے نمایاں تھی۔

ایک تصنع سے بھرپور مشینی زندگی سے فطرت کی سادگی اور دائم حقیقتوں کی اس دنیا میں آکر انھیں کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دوبارہ پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بالکل اسی طرح یہاں کے لوگ شہری زندگی کے لیے ترستے ہوں۔ بہرحال یہ تضاد تو انسان کی فطرت تھی اور شاید تغیر پسندی ہی زندگی کی روح رواں ہوتی ہے۔

Akram Allahabadi

انھیں اس گاؤں میں ایک اچھا خاصا کچا، مگر صاف کشادہ اور ہوادار مکان ملنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ گئے وقتوں کے ایک زمیندار ٹکارام جوشی نے ان کی یہ مشکل فوراً حل کردی۔ اس کا یہ آبائی مکان اکثر ایسے ہی سیاحوں کے کام آجایا کرتا تھا۔ وہ بھی دل کا اتنا رئیس تھا کہ منہ سے کوئی معاوضہ یا کرایہ نہ طلب کرتا۔ لوگ خود جو کچھ دے جاتے، لے لیتا اور اسے اس کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ اپنے خاندان میں اب وہ اکیلا ہی رہ گیا تھا۔ بچے اولادوں والے ہوکر حیدرآباد میں جا بسے تھے، مگر اس نے اپنے اس گاؤں کو نہ چھوڑا تھا، جہاں اس کے باپ دادا سب ہی پیدا ہوئے، پلے، بڑھے اور مرے کھپے تھے۔

انھیں اس قیام کے بعد زندگی بالکل ہی ایک نئے رخ سے نظر آئی۔ خودکفیل، سادہ، مگر حقیقی سکون وراحت سے بھرپور۔ اور انھیں بالکل ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ دوبے، یہ مدن، یہ مرزا جی، یہ چوبے چکی، یہ جمشید جی جہانگیر اور کرن اور پروین سب ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ وہ سب ایسے ہی پودے اور درخت ہیں جو ایک ہی زمین سے اگے ہوں۔

اس احساس نے ان کی فطرت میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کردی۔ جمشید جی، جنھیں اپنے بیوپار کے نفع نقصان کے سوا نیا کی کسی چیز، کسی رشتے کی پرواہ نہیں رہتی تھی، اپنے دل میں ساتھیوں کے لیے ایسی محبت محسوس کرنے لگے، جیسے وہ ان کے قریبی رشتے دار ہوں۔ ڈاکٹر دوبے جنھیں حشراتیات سے دلچسپی تھی، یہاں کے دیہاتیوں تک سے دلچسپی لینے لگے۔ کرن اور پروین سگی بہنوں جیسی بن گئیں اور انھیں دیہات کی لڑکیاں بھی اپنی بہنیں نظر آنے لگیں۔ حالانکہ ان میں زیادہ تر کل بھجنگی اور گندے لباسوں والی ہی تھیں، جنھیں اگر وہ شہر میں دیکھ پاتیں تو شاید نفرت سے منہ پھیر لیتیں۔ اور مرزا جی اور چوبے جی تو خیر سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں لیے پھرتے تھے۔ ان کے رشتے دار تو ہر جگہ نکل آیا کرتے تھے، بلکہ چوبے جی نے تو زمیندار سے باتیں کرتے کرتے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ان کے خاندان میں بھی ایک جوشی گزرے ہیں، ممکن ہے جوشی جی ان ہی کی ذریات میں سے ہوں۔ ان میں یہ تبدیلی اس فطری

تقاضے کی دلیل تھی، جسے شہری زندگی کے مصنوعی اور خودغرض ماحول نے کچل کر رکھ دیا تھا۔

شہر میں گر وہ اتنا بڑا مکان حاصل کرتے تو کئی ہزار کی پگڑی بھرنے کے علاوہ انھیں بہت سا کرایہ بھی ادا کرنا پڑتا، لیکن یہاں تو ان سے کرائے کا بھی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ اس مکان میں کل چھ کمرے، ایک دالان، ایک صحن اور نیچی سی چھت کے برآمدے والی ایک بیٹھک تھی، چھپر کبیلوؤں کا تھا، جس سے دن میں بھی تارے جھانکتے نظر آتے۔ زمین کچی تھی، مگر اس میں وہ قدرتی سوندھاپن موجود تھا، جو انسان کے خمیر میں اپنا بڑا حصہ رکھتا ہے۔ دیواروں پر پلاسٹر کی جگہ گوبر اور مٹی کی ہی لیپ تھی، لیکن یہ اس ماربل سے قیمتی تھی، جسے بنانے والوں کے ہاتھوں میں جھریاں پڑ جاتی ہیں، مگر جس کی تمام چمکنا ہٹ بیوپاریوں کی تجوری میں چلی جاتی ہے۔

انھیں اس نئی قیام گاہ میں کمروں کی تقسیم اور انتظامات کرتے دوپہر ہوگئی۔ کھانا آج دوپہر کے بعد ہی کھایا گیا اور اس کے بعد سب ہی سفر کی تھکن دور کرنے کے لیے آرام کرنے لگے۔ نہ جانے کیوں یہاں پہنچ کر ڈاکٹر مدن کو بھی ایک ذہنی سکون، ایک ازسرنو تازگی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ دوسرے گھوڑے ہی بیچ کر سوتے ہوں گے، مگر وہ خود کو بیچ کر سو گیا۔ رات کے کھانے کے بعد جوشی نے ان کے لیے مکان کے باہر کھلی جگہ میں چارپائیاں ڈالوا دیں۔ اس گاؤں میں میز کرسیاں کہاں ملتیں۔ یہاں کے لوگ تو ہمیشہ سے زمین پر یا چارپائیوں پر بیٹھتے آئے تھے اور چوپال ہوتی تو گھاس پر۔ ان کے سروں پر حدِ نظر تک نیلے آسمان کی قنات تنی ہوئی تھی، جس میں تارے ٹکے ہوئے تھے۔ ہوا تازہ اور خنک تھی اور سانس لیتے ہوئے پھیپھڑوں کو ایک عجیب سی فرحت محسوس ہوتی تھی۔ بڑا رومان پرور مقام تھا یہ۔ ڈاکٹر دوبے ایک چارپائی پر لیٹ کر ٹمٹماتے تاروں کو اس طرح تک رہا تھا، جیسے وہ آسمان کے گرگٹ ہوں۔ اور مرزا جی اور چوبے جی، زمیندار جوشی کے حقے میں حصے دار بن گئے تھے۔ چوبے جی حقہ پیے جاتے اور زمیندار کی تمباکو کی برائی کرتے جاتے تھے۔ وہ بیچارہ شریف آدمی اس پر بھی انکساری سے گردھلا ہلا کر کہہ رہا تھا، اب کی بار کبھی آپ لوگ آئیں گے تو لکھنؤ کی تمباکو پلاؤں گا۔ جمشید جی جہانگیر،

ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا۔

''میں اس گاؤں میں ایک بنگلہ ضرور بنوائینگا۔کیا مجید ارسین سینری ہے۔''

''ہاں ہاں، بلکہ اپنا قبرستان بھی یہیں بنوالینا، تا کہ مرنے کے بعد بھی خوش رہ سکو۔''

ڈاکٹر نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو سر کا تکیہ بناتے ہوئے کہا۔

''یہ مرنے کی بات اپنے کو اچھی نہیں لگتی۔''جمشید جی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''دولت جو بہت سی جمع کر رکھی ہے۔کنجوسوں کا تو دم بھی بڑی مشکل سے نکلتا ہے۔''

ڈاکٹر نے اسے اور بھڑکایا۔

''کون کنجوش؟ میں ابھی دایا بھائی اسپتال کے لیے دو لاکھ کا ڈونیشن دیا ہے۔''

جمشید جی نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

''معلوم ہے۔تا کہ اسپتال بنوانے کا ٹھیکہ تمہیں مل جائے۔''ڈاکٹر نے مسکرا کر طنز کیا۔

''وہ تو اپنا دھندہ ہے۔میں نہیں کرینگا، کوئی دوسرا کرینگا۔''

''خیر خیر۔''یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے پلٹ کر دیکھا۔کرن اور پروین دونوں غائب تھیں۔ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ برآمدے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔''ارے، یہ لوگ کہاں چلی گئیں؟''وہ بولا۔

جوشی نے سن لیا، وہ فوراً بول پڑا۔''ناچ دیکھنے گئی ہونگی، ڈھولک کی آواز نہیں آ رہی، ہمارے یہاں اکاوشی کا ناچ ہر سال میں دس دن تک ہوا کرتا ہے۔یہ تہوار اسی طرح یہاں صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔''تکا رام جوشی نے بتایا۔

''مگر کس کے ساتھ گئی ہیں؟''جمشید جی نے بھی تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

''گھبرایئے نہیں، میں نے انھیں ڈاکٹر مدن کے ساتھ جاتے دیکھا ہے۔''مرزا جی بول پڑے۔

Akram Allahabadi

''تب تو فکر کی بات نہیں۔'' ڈاکٹر دوبے یہ کہہ کر پھر جمشید جی کی طرف متوجہ ہو گیا اور وہ حکومت کی شراب بندی کی پالیسی پر بحث کرنے لگے۔

''تو چوبے جی، ہم لوگ بھی کیوں نہ چلیں ناچ دیکھنے۔'' مرزا جی کچھ سوچتے سوچتے اچانک تجویز پیش کی۔

''اہاہا، کیا وچار ہے۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔'' چوبے جی نے برا سا منہ بنا کر حقے کی نلکی ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''اگر میرے دھرم میں اجازت ہوتی تو میں تم سے دو زیادہ کر کے دکھا دیتا، سمجھے کیا ہو۔'' چوبے جی بھی جوش میں آ گئے۔ اور جوشی ہنسنے لگا۔

''جبھی تو آج تک ایک چوہے کے بھی والد محترم نہیں بن سکے ہیں آپ۔'' مرزا جی نے طنز کیا۔

''اور تم نے تو بہت سے ہاتھی پیدا کر دیے ہونگے۔'' چوبے نے جواب دیا۔

''ارے، آپ لوگ تو جھگڑنے لگے۔'' جوشی گھبرا گیا۔

''کون...؟ ہم....؟'' دونوں نے ایک ساتھ چونک کر کہا۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیے۔

''جوشی جی، ہماری دوستی پچاس سال پرانی ہے۔'' چوبے جی نے ہنستے ہوئے بتایا۔

ارے ہاں، جوشی جی، آپ بھی کیا ایلورا کی نسل سے ہیں؟'' مرزا جی نے جوشی سے عجیب سا سوال کیا۔

''معاف کیجیے گا، میں کھنڈروں کی نسل سے نہیں ہوں۔'' جوشی نے ہنس کر کہا اور مرزا ی سے دوسرا سوال نہ بن پڑا۔

''مگر یہ کیسے کھنڈر ہیں؟'' چوبے جی نے پوچھا۔

''کھنڈر تو زمین سے لگ چکے ہیں، مگر غار ابھی تک ہیں۔ دن میں جایئے تو وہاں

سناٹے میں ان غاروں میں کھڑی پتھر کی خاموش مورتیاں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر ایلورا کی رات بڑی بھیانک ہوتی ہے۔ میلوں تک صرف ویرانی، سناٹے اور اندھیرے کا راج۔ اور اس اندھیرے میں یہ کھنڈرات اور غار بڑے اجاڑ اور ڈراؤنے معلوم ہوتے ہیں۔'' جوشی بتانے لگا۔

''لوگ تو راتوں کو بھی جاتے ہوں گے وہاں؟''

''نہیں، رات کو کوئی ادھر نہیں جاتا۔ بڑے بوڑھے کہتے آئے ہیں کہ ایلورا رات کے وقت کسی ویران مرگھٹ کی طرح ڈراؤنا ہو جاتا ہے۔ اور وہاں میدانوں اور کھنڈروں میں روحوں کے سائے بھٹکتے پھرتے ہیں۔ آپ سے آپ بجنے والے گھنٹوں کی مدھر مدھم آوازیں آتی ہیں اور کبھی کبھی ایک عجیب سا شور سنائی دیتا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' مرزا جی نے کسی قدر خود سے متاثر لہجے میں پوچھا۔

''آپ گاؤں میں جس سے پوچھیں گے، یہی بتائے گا۔ اور خاص کر پرانے لوگ تو اس طرح کہتے ہیں جیسے اپنی آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا ہو، مگر شہری لوگ شاید ایسی باتوں کو کم مانتے ہوں۔ پھر بھی رات کو اس اجاڑ علاقے میں جانے کی ہمت کوئی نہیں کرتا۔'' جوشی نے بتایا۔

''کچھ نہ کچھ بات ضرور ہوگی۔ ایسے بھلا کوئی کیوں کہہ دے گا۔'' چوبے جی نے جوشی کی تصدیق کی۔ اور مرزا جی سوچ میں پڑ گئے کہ اگر واقعی یہ معاملہ ہے تو برے پھنسے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

# ایلورا

گاؤں کے چودھری کی چوپال کے سامنے میدان کے بیچ وبیچ آگ کا الاؤ روشن تھا اور اس کے چاروں طرف گوری گوری اور سانولے سانولے رنگ کی گداز جسم والی گاؤں کی نوخیز دوشیزائیں ہاتھوں میں اپنے لہنگوں کے سرے پکڑے اور ایک ایک ہاتھ میں تقریباً درجن درجن بھر چوڑیاں پہنے اکاشی کا ناچ ناچ رہی تھیں۔ اور تین ڈھولک والے تین طرف کھڑے ڈھولک بجا رہے تھے۔ وہ گاتی بھی جاتی تھیں۔ ان میں ایک کھلے ہوئے رنگ کی معصوم چہرے والی خوبصورت لڑکی تھی، جس کا رقص ان سب سے الگ معلوم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر کی نگاہیں اسی پر لگی تھیں۔ اس کے رقص میں ایک لچک، ایک انوکھا پن تھا۔ اسے یہاں کی لڑکیوں کے رقص کے انداز دیکھنے کی سنک اس جگہ کھینچ لائی تھی۔ ممکن ہے اس مجسمے کی ادا ان کے ان کے اندازِ رقص سے ملتی ہو اور تب ہو سکتا ہے کہ اس فنکار نے محض ایک شکل کو لے کر اس دور کی نرتک کلا کا کوئی ایک پوز پیش کرنے کی کوشش کی ہو۔ ان لڑکیوں کا اندازِ رقص 'کتھک' سے ملتا جلتا تھا، جو گروپ میں ناچا جا رہا ہو۔ اسے جوشی نے ہی گاؤں میں ہونے والے اکاوسی کے ناچ کی خبر دی تھی۔ اور جب وہ خاموشی سے اکیلا ہی نکل پڑنے کا روگرام بنا رہا تھا، کرن اور پروین بھی اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ کیوں کہ جوشی نے یہ ذکر ان کے سامنے کیا تھا۔

گاؤں والوں کے لیے ان اجنبیوں کی آمد کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ یہاں گورے، کالے سیاح آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ انھوں نے سوائے اس کے ان کی طرف اور کوئی توجہ نہیں کی کہ انھیں ایک چبوترے پر بیٹھنے کی جگہ دے دی۔

گاؤں کے لوگ اپنی تھکن، اپنی پریشانیاں، گزرے ہوئے کل کے غم اور آنے والے کل کی فکر بھول کر اس وقت رقص میں پوری طرح کھوئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے دل اسی

Akram Allahabadi

طرح بہلاتے تھے۔یا تو چوپالوں اور بیٹھکوں میں قصے کہانیوں میں رات کی تفریح ہو جاتی تھی یا پھر تہواروں کے ایسے پروگراموں میں اور سال میں دو چار بڑے میلے لگ جاتے تو اور لطف آجاتا۔

''یہ تو رمبا ناچ رہی ہے نا، کرن؟'' پروین نے رقص دیکھتے دیکھتے اپنی رائے دی۔

''نہیں، یہ ٹھیٹ ہندوستانی ناچ ہے۔تمہارا رمبا سمبا نہیں ہے۔'' کرن نے ہنس کر جواب دیا۔

''ہاؤ لولی۔'' پروین نے سسکی بھر کر کہا اور غیر ارادی طور پر اس کی نظریں ڈاکٹر مدن کی طرف اٹھ گئیں۔ڈاکٹر کا پروفائل اسے بہت خوبصورت نظر آرہا تھا۔اس لیے اس نے ایک جملے سے دو کام لیے۔مگر کرن نہیں سمجھ سکی۔ادھر ڈاکٹر نے جب پلٹ کر دیکھا تو پروین ایک سحر طراز ادا سے مسکرادی۔اسے کیا معلوم تھا کہ اس پتھر پر ایسی مسکراہٹیں خراش بھی نہیں ڈال سکتیں۔

''تم لوگوں کو تو پکنک کا مزا آرہا ہوگا۔'' ڈاکٹر نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ویسے اس کا تخاطب کرن سے ہی تھا۔

''کیوں نہ آئے گا بھلا۔'' پروین یہ کہتے ہوئے کرن کی طرف دیکھ کر مسکرادی اور کرن بھی ایسی ناسمجھ نہ تھی کہ اس فقرے کو نہ سمجھ سکے۔کوئی جواب دینے کی بجائے اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔اس نے رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ڈاکٹر شاید سمجھ کر بھی انجان بن گیا۔وہ پھر رقص کرتی ہوئی لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

اچانک ایک عجیب سی بات ہوئی۔لڑکیاں رقص کرتی ہوئی ان کے سامنے سے گزر رہی تھیں کہ ڈاکٹر ایک چہرے کو دیکھ کر چونک پڑا۔آپ سے آپ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور سر اس طرح گھومنے لگا جیسے کسی موٹر کا پہیہ بڑی تیزی سے اس کا ذہن پچھلی رات کے خواب کی طرف دوڑ گیا۔اور پھر مجسمے کی طرف، مگر نہیں ہوسکتا ہے۔یہ محض اس کا وہم یا فریب نظر ہو۔یہ سوچ کر وہ دوسرے لمحے سنبھلا۔

''آپ ناچ کے بڑے شوقین معلوم ہوتے ہیں۔'' اسے اپنے کانوں میں کرن کی آواز سنائی دی۔کرن کا لہجہ کچھ جذباتی اور طنز کا پہلو لیے ہوئے تھا۔وہ اسے محسوس کیے بغیر نہ رہا،مگر اپنی عادت کے مطابق صرف مسکرا دیا۔

''میں تو خیر انھیں اسٹیڈی ہی کر رہا ہوں۔'' وہ بولا،''لیکن شوق تو تم لوگوں کو گھسیٹ کر لایا ہے۔''

''اوہ،نو... میں تو کرن کے ساتھ آ گئی۔ مجھے یہ ہندوستانی ڈانس پسند نہیں ہیں۔'' پروین نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''کیوں ہونے لگے، ہندوستانی جو ٹھہرے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا،لیکن وہ شاید اس کا مطلب نہ سمجھ سکی اور اپنی ترقی پسندی کا اور بڑھ کر مظاہرہ کرنے لگی۔

''میرے کو تو راک این رول اور میری گوراونڈ بھوت پسند ہے۔آئی لو دیم۔'' اس نے غیر ہندوستانی لہجے میں کہا۔

''تب تو تمھیں امریکہ کا ٹکٹ کٹوا لینا چاہیے۔ہندوستان تمہارے رہنے کے لائق ملک نہیں۔'' کرن نے جلا ہوا سا جواب دیا۔

''اوہ... آئی مین نو انسلٹ۔میں تو اپنی پسند کا بات کرتی۔'' پروین نے اس کا موڈ بگڑتے دیکھ کر گھبرا کر کہا۔

''خیر خیر،پسند اپنی اپنی۔چھوڑو یہ جھگڑا۔'' ڈاکٹر نے اس بحث کو ختم کرنے کے لیے کہا اور پھر رقص گاہ کی طرف دیکھنے لگا۔مگر نہ جانے کیوں اب کرن کو اس رقص سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔اس کا دل گھبرا رہا تھا۔شاید اس کا سبب یہی ہو کہ ڈاکٹر مدن بڑے غور سے اس کی کو دیکھ رہا تھا۔اس کے رقص کی ایک ایک ادا پر اس کی نگاہ تھی۔

وہ لڑکی اب دوسرے راؤنڈ میں پھر قریب آ رہی تھی اور ڈاکٹر کی نظریں اس کے پیکر پر جمی ہوئی تھیں۔وہ اس طرح مبہوت کھڑا تھا،جیسے اپنا ہوش بھی نہ ہو۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔وہ سامنے سے گزر رہی تھی اوراس باران کی نگاہیں ٹکرا گئی تھیں۔وہ اس حسین نقوش والے چہرے کو کیسے بھول سکتا تھا، جسے اس کے چھوٹے مجسمے سے اس نے خودتراشا تھا، جسے اپنی آنکھوں سے اس نے ڈھائی ہزار برس پرانے ایلورا میں چلتے پھرتے دیکھا تھااور جس سے ایک بارخواب میں بھی اس کی نگاہیں اس وقت ٹکرائی تھیں جب وشنومندر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مدن نے نے اسے اوپر سے اڑکر آتی ہوئی چٹان کے خطرے سے آگاہ کیا تھا۔اس نے اچانک پلٹ کراس کی طرف دیکھا تھا۔وہ ان آنکھوں،اس چہرے کو کیسے بھول سکتا۔لباس مختلف ہوتو کیا ہوا،اس کی ہرادا وہی تھی۔ایک شریف آدمی کی حیثیت سے وہ کسی سے یہ بھی تو نہ پوچھ سکا کہ وہ لڑکی کون ہے؟ کیا ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ لوگ کیا سمجھتے،اگر وہ پوچھ بیٹھتا۔مگرحیرت کی بات یہ کہ وہ اسے پھراس ہجوم میں نظر نہ آئی،البتہ اس کے گھنگھروؤں کی جھنکاراب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''کیا یہیں بیٹھ رہنے کاارادہ ہے؟'' کرن نے اسے بازو سے جھنجوڑ کرپوچھا۔

''ایں... ہاں...چلو...'' وہ بادلِ نخواستہ بولا۔شایداس نے دل میں طے کرلیا تھا کہ وہ کسی وقت دن میں اس کوگاؤں میں تلاش کرے گا۔آخروہ کون ہوسکتی ہےاور کیوں بالکل ویسی ہی ہے،جیسی اسے خواب میں نظر آئی تھی اور جیساوہ مجسمہ۔

''مجھے معلوم ہوتا کہ تم لوگ اس طرح بور کروگی تو اکیلا ہی چلا آتا۔'' وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

''تو ہم لوگوں کی موجودگی سے آپ بورہورہے تھے؟'' کرن کا لہجہ شکایتی تھا۔

''اوہو... یہ بات نہیں،میرا مطلب ہے یہ گھڑی گھڑی موڈبدل لینا۔'' وہ بات پلٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

''اچھا مہاتماجی،اب آپ اکیلے ہی آیا کریں،بس۔'' کرن نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔ڈاکٹرہنس پڑا۔

''ہاتھ جوڑتی ہو تو معاف کر دیتے ہیں۔'' وہ اسے چڑانے کے لیے بولا۔

''کیوں، میں نے کونسا قصور کیا ہے آپ کا؟'' کرن نے ہاتھ نیچے گرا کر چڑتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کیا کم قصور ہے کہ آئیں تو بڑے شوق سے رقص دیکھنے اور پھر چلو چلو کی رٹ لگائی۔''

''آپ پھر بھی آسکتے ہیں۔ یہاں ہمیں واپس چھوڑنے جانے والا بھی تو کوئی نہ تھا۔'' اس نے کہا۔

''مجھے ایک عادت بری لگتی ہے، خواہ وہ کسی میں بھی ہو۔'' ڈاکٹر سنجیدہ ہو گیا۔

''کیا؟'' پروین نے دخل سے کر پوچھا۔

''رونی شکل بنالینا۔'' اس کا اشارہ کرن کی طرف تھا۔

''میں کیوں روؤں...'' کرن نے کہنا چاہا۔

''وہ تو شکل ہی ایسی ہے۔'' پروین بیچ میں بول اٹھی۔ اور وہ اور ڈاکٹر مدن دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے، مگر پھر ڈاکٹر کو یہ دیکھ کر سنجیدہ ہو جانا پڑا کہ کرن کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ وہ کسی ایسے خیال سے سٹپٹا گیا جو اس کے نزدیک ایک شدید قسم کی غلط فہمی کی بنیاد ڈال رہا تھا۔ اس نے خاموش رہ جانا ہی مناسب سمجھا اور وہ تینوں گم سم سے چلتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک سوچ رہا تھا، ایک دوسرے کے بارے میں۔

☆☆☆☆☆☆

ایلورا کے غار تک پہنچتے پہنچتے ساڑھے ۹ بج چکے تھے۔ ان کا ارادہ تو تھا اور سویرے آنے کا، مگر چوبے جی پورے ایک گھنٹے حوائج ضروری سے فراغت میں لیتے تھے۔ کم از کم آدھا گھنٹہ تو انہیں 'وتون' کرتے لگتا تھا۔ مرزا جی اور کچھ کریں یا نہ کریں، مگر صبح کی نماز ضرور پڑھ لیا

کرتے تھے اور یہ بھی ایک عجیب عادت تھی کہ نماز کے بعد وہ پھر کم از کم ایک گھنٹے کے لیے ضرور سو جاتے اور اگر کوئی اٹھاتا نہیں تو شاید کئی گھنٹوں تک بھی سو سکتے تھے۔ ڈاکٹر مدن اور کرن دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے سے شرط بد کر سوتے تھے۔ کبھی ڈاکٹر ۸ بجے سو کر اٹھتا اور کبھی کرن ساڑھے ۸ بجے۔

جمشید جی، پروین اور ڈاکٹر مدن البتہ سویرے سے ہی اٹھے ہوئے تھے۔ مرزا جی نے اپنے تھیلے میں اسٹو بھی رکھ لیا تھا، تاکہ کھانا وہیں تیار کر کے کھایا جائے۔ ارادہ یہی تھا کہ دوپہر بھی وہیں گزاری جائے گی۔

ان کی نگاہوں کے سامنے دور تک ناہموار چٹانیں پھیلتی چلی گئی تھیں، جن کے بیچ بیچ خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور ایلورا کے کھنڈرات دور سے ہی نظر آ رہے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں وہ غار تھے جن میں ڈھائی ہزار سال قبل ایلورائی فنکاروں نے اپنے شاہکار تراشے تھے۔ دامنِ کوہسار میں ایسے آثار پھیلتے گئے تھے جو اب سے پہلے صدیوں پرانی اس عجیب تہذیب کی یاد دلاتے تھے۔

یہاں پہنچ کر سب ہی رک گئے اور عبرت کی نظروں سے اس منظر کو دیکھنے لگے۔

''اب سے ہزاروں سال پہلے نہ جانے کیسے انسان رہتے ہوں گے۔ کتنا عجیب زمانہ ہوگا وہ، کتنا مختلف۔ نہ جانے کیسی باتیں کرتے ہونگے وہ لوگ۔ کیسے طور و طریق ہوں گے ان کے۔'' ڈاکٹر دوبے نظر غور سے ان آثار کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔

''انسان تو ہمارے ہی جیسے تھے، مگر رہن سہن اور تہذیب میں ہم سے مختلف ضرور تھے۔'' مدن نے جواب دیا۔

''لاحول ولاقوۃ۔'' مرزا جی کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کیے لاحول پڑھ رہے تھے۔ اور چوبے جی کی نظریں بھی اسی طرف اٹھ گئیں، جہاں دیکھ کر مرزا جی نے آنکھیں بند کی تھیں۔

Akram Allahabadi

''چھی چھی چھی، یہی آرٹ وارٹ ہے کیا اس ایلورا کا؟ رام رام..ایسا ننگا پن۔''

چوبے جی نے بھی مرزا جی کا ساتھ دیا۔اور ڈاکٹر مدن ہنس پڑا۔اس نے سامنے ایک پہاڑ کے دامن میں ایک چٹان پر تراشے گئے ایک مجسمے کی طرف اشارہ کیا اور ڈاکٹر دوبے تب سمجھا کہ مرزا جی اور چوبے جی کیوں آنکھیں بند کر رہے تھے۔اس چٹان پر ایک عریاں مورتی تراشی ہوئی تھی، جس کی کمر پر صرف ایک باریک سا پٹکا لٹک رہا تھا۔باقی جسم سینے سمیت عریاں تھا۔ڈاکٹر دوبے یہ دیکھ کر مسکرا دیا کہ آنکھیں ڈھانک لینے کے باوجود دو انگلیوں کے بیچ کی درمیانی خلاء سے چوبے جی اس مورتی کو جھانک رہے تھے۔

''چوبے جی، اس زمانے میں اس قسم کی باتیں عیب نہیں ہوا کرتی تھیں۔'' ڈاکٹر مدن نے انھیں سمجھایا۔

''تو پھر ہٹا لوں ہاتھ آنکھوں سے، پاپ تو نہیں ہوگا؟'' چوبے جی نے دوسرے کی اجازت کی آڑ لینی چاہی۔

''ہاں ہاں، ہٹا لو، کچھ نہیں ہوگا۔'' ڈاکٹر دوبے ہنس کر بولا۔

''امے، جو تمہارا ہوگا، وہ میرا ہوگا۔'' یہ کہہ کر مرزا ی نے بھی شرم بالائے طاق رکھ دی۔لیکن لڑکیوں پر اس کا کوئی ردِعمل نہیں ہوا تھا۔وہ ایسے مجسموں کی تصویریں بارہا اپنی کورس کی کتابوں اور سرکاری معلوماتی فلموں میں دیکھ چکی تھیں، جس کی تشہیر خود حکومت پردۂ سینما پر اور کتابوں میں کرتی ہو، اسے معیوب کیسے سمجھا جا سکتا۔

''میرا خیال ہے یہ لوگ اجنتا دیکھیں گے تو شرم و حیا سے وہیں زمین میں گڑ کر رہ جائیں گے۔'' ڈاکٹر مدن نے چوبے جی اور مرزا کی طرف اشارہ کر کے ڈاکٹر دوبے سے کہا۔

''اچھا ہے، ہم ان کے کپڑے اتار کر ساتھ لیتے آئیں گے اور لوگ انھیں بھی تاریخی مورتیاں سمجھنے لگیں گے۔'' ڈاکٹر دوبے نے ان دونوں کو چھیڑنے کے موڈ میں کہا اور اس جملے پر کوئی اپنا قہقہہ نہ روک سکا، سوائے چوبے جی اور مرزا جی کے، لیکن بعد میں یہ سمجھ کر کہ شاید اس

بات پر ہنسنا ہی چاہیے، وہ بھی ہنس دیے۔

ان غاروں کی سیر میں انھیں کافی وقت لگ گیا۔ یہاں دیواروں پر انھیں اس دور کے ایلورا کی پوری تہذیب نظر آ گئی۔ ڈاکٹر مدن انھیں ایک ایسے مجسمے کے بارے میں سمجھا رہا تھا، یہ راجا رانی رہے ہوں گے۔ یہ رانی کی داسیاں۔ یہ راجا کے چاکر۔ فصلیں ضرور اس دور میں ہوتی تھیں۔ یہ ننگی عورت سر پر گٹھا لیے ہوئے ہے، اس کا مطلب ہے کہ اس زمانے میں آج کل عورتوں کی طرح عورتیں کاہل نہیں تھیں۔

''عورتیں کبھی کاہل نہیں ہوتیں، مرد ہی کاہل ہوا کرتے ہیں۔'' کرن جلدی سے بول اٹھی۔

''اگر یہ بات ہے تو ہم لوگوں کے لیے کھانا پکا کر دکھا دو۔'' ڈاکٹر دوبے نے مدن کی طرف سے جواب دیا۔

''برے پھنسے۔'' کرن نے دونوں ہاتھ جھٹک کر پروین سے کہا۔

''میرے کو تو اسٹیک بنانے کو آتا ہے، بس۔'' پروین نے یہ کہہ کر اپنی جان بچانی چاہی۔

''ارے بھئی، ہم لوگ بھی مدد کر دیں گے نا۔ آخر اپنے کام میں شرم کاہے کی۔'' مرزا جی نے سہارا دیا۔

''بے شک بے شک، آپ ہی کا کام ہے۔'' ڈاکٹر دوبے نے فقرہ چست کیا۔ اور جمشید جی نے منہ پر رومال رکھ لیا۔

''کیا مطلب؟ یعنی کہ ہم خانساماں ہوئے؟'' مرزا جی بگڑ گئے۔

''اور ہم رسوئیا ہوئے۔'' چوبے جی نے بھی ساتھ دیا۔

''چچ چچ... کیا غلط فہمی ہوئی ہے آپ لوگوں کو۔ ہمارا مطلب تو یہ تھا کہ کھانا تیار کرا لینا آپ لوگوں کے ہی بس کا کام ہے، ورنہ ہم لوگ تو اس معاملے میں صفر کی طرح کورے ہیں۔''

Akram Allahabadi

ڈاکٹر مدن نے جلدی سے ڈاکٹر دوبے کی مدد کی۔

''کیوں، بابا جی، کیا یہی مطلب تھا ان کے جملے کا؟'' مرزا جی نے انصاف کے لیے جمشید جی کو ثالث مقرر کیا۔

''ہاں، بابا جی۔'' جمشید جی نے ڈاکٹر دوبے کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اور چوبے جی اور مرزا ی دونوں مطمئن ہو کر ہنس پڑے۔

باہر دھوپ کی جس قدر تپش تھی، یہ غار اندر سے اتنے ہی سرد تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے ہوں۔ اور ایک عجیب بات یہ تھی کہ باہر کی گرام ہوا بھی اندر داخل ہوتی تھی تو سرد ہو کر بڑی فرحت بخش لگتی تھی۔ باہر ایک درخت کے سائے میں کھانا پکانے کی تیاریاں ہونے لگیں، مگر ڈاکٹر کو ایلورا دیکھ کر اپنے تاریخی گرگٹ بری طرح یاد آ رہے تھے۔ اپنے کِٹ سے انھوں نے گرگٹ پکڑنے کا پھندا نکالا اور ٹھنڈے شیشوں کی عینک چڑھا کر تیار ہو گئے۔

''آپ کدر جاتے، ڈاکٹر؟'' جمشید جی نے پوچھا۔

''تم لوگو کے لیے تازی تازی مچھلیاں پکڑ کر لاؤں گا۔'' ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

''مچھی اور چٹانوں میں؟'' جمشید جی نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں نہیں؟ زمین پر رینگنے والے جانور تھے ہی کب، پانی سے نکل کر ہی تو رینگنا سیکھے تھے اور پھر خشکی میں پھیل گئے۔'' ڈاکٹر نے دوربین اور بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔ مگر جمشید جی کے پلے خاک نہیں پڑا۔ وہ اس کی صورت ہی دیکھ رہے تھے۔

''تو میں کیا کرینگا ادر۔'' جمشید جی نے بے چارگی سے پوچھا۔

''تم تب تک بیٹھ کر ڈاکٹر مدن سے باتیں کرو۔ میں کھانا تیار ہونے تک لوٹ آؤں گا۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر دوبے نے جب پلٹ کر دیکھا تو ڈاکٹر مدن کا تو پتہ ہی نہ تھا۔ وہ آس پاس بھی کہیں نہ تھا۔

Akram Allahabadi

''لو، یہ آٹا رقدیمہ کا کیڑا تو مجھ سے پہلے ہی رینگ گیا۔'' ڈاکٹر بڑبڑایا۔

''اچھا اب ایسا کرو کہ غار کی مورتیوں سے کچھ دیر کتھک ڈانس سیکھو، میں ابھی آیا۔''

ڈاکٹر نے جمشید جی کے کدو جیسے صاف سر پر ہاتھ پھیر کر کہا اور باہر نکل گیا۔

''باولا چھے، باولا، یکدم'' وہ بڑبڑانے لگے۔

ان بوڑھوں کی آپس میں اسی طرح چلتی تھی اور وہ نجی نشستوں میں اتنے ہی خوبنظر آیا کرتے تھے، جیسے شریر بچے۔ حالاں کہ ان کی زندگی کا مصروف پہلو حد درجہ سنجیدہ واقع ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

# چٹانوں پر

وہ اس طرف پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ پچھلی بار جب اس نے ایلورا کے تاریخی آثار کا اپنے نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا تھا تب بھی اسے ان غاروں کے عقبی علاقے کی طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، کیوں کہ ماہرین آثار کے لیے جو کچھ تھا یہیں تھا۔ اس وقت تو وہ اتفاق سے بھٹکتا ہوا اس طرف آنکلا تھا اور یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل چلی تھیں کہ یہ وہی مقام تھا جو اس نے اس رات خواب میں دیکھا تھا۔ بالکل ویسی ہی دور تک پھیلتی چلی گئیں پرت دار چٹانیں، گردشِ زمانہ سے اپنے نقوش ونشان کھوئے ہوئے زمین بوس آثار یہاں بھی تھے، لیکن ان میں کسی آرٹ کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا۔ ممکن ہے ایلورا کی آبادی والے حصے کے مکانات رہے ہوں۔ اور اسی وجہ سے شاید ان کی طرف کبھی توجہ نہ دی گئی ہو۔ وہ ان آثار کو دیکھتا ہوا چٹانوں کے پرت دار ڈھلوان پر اترتا چلا گیا۔ دوپہر کافی گرم تھی اور چٹانیں تپ رہی تھیں، لیکن ہوا کیونکہ تیز چل رہی تھی، اس لیے تمازت کا احساس نہیں ہو رہا تھا اور اس وقت تو وہ محویت کے ایک عجیب عالم میں تھا۔ ہر چیز اسے اس خواب جیسی نظر آرہی تھی، سوائے اس کے کہ مکانات اور وہ مندر جو ٹیلوں پر تھے، منہدم ہو کر تقریباً نابود ہو چکے تھے، لیکن اس اونچے ٹیلے پر اس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں جہاں ابھی تک گول سیڑھیوں کے آثار موجود تھے۔ وہ صرف کہیں کہیں نظر آتی تھیں۔ ان پر ملبے اور مٹی نے جم کر ٹیلے کو اور بلند کر دیا تھا اور خودرو جھاڑیاں اور خشک جنگلی گھاس ہر طرف اگی ہوئی تھی۔

راستے میں اسے چٹانیں جگہ جگہ درکی نظر آئیں، مگر خلاء نہیں تھا۔ بلکہ ان دراڑوں میں مٹی یا کوئی چیز بھر کر اسے پر کر چکی تھی۔ اگر واقعی اس کے خواب کے مطابق یہاں کوئی تباہ کن زلزلہ آیا ہوگا تو شاید ان دراڑوں کو لاوے نے ہی پر کر دی ہوگا اور زمین پر بھی کیونکہ وہ نشیب

میں ہی رہی ہوگی لاوے کی چادروں نے بہہ کر درکے ہوئے حصوں کو پاٹ دیا تھا۔ بلکہ ممکن ہے کہ چٹانوں کا نشیبی حصہ اس وقت زمین ہی رہا ہواور لاوے نے اس پر جم کر صدیوں میں بتدریج پرت دار چٹانوں کی شکل اختیار کرلی ہو۔وہ یہی سب سوچتا چل رہا تھا،لیکن پھر اس کے ذہن سے ایک عجیب سوال ابھرنے لگا،جس نے خود اسے الجھن میں ڈال دیا۔آخر وہ خواب اسے کیوں نظر آیا تھا۔خاص کر ایسی صورت میں جب کہ وہ اسی مقام کو اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور پھر اس سے اس کا ذہن سلسلے ملانے لگا۔وہ مجسمہ جو کباڑی کی دکان پر اسے ملا، وہ اسے کیوں اس قدر پسند آیا تھا؟ آخر کیوں؟ اور کیوں اس کا جی چاہا کہ وہ اس کا ایک قدِ آدمی مجسمہ تراشنے اس انہماک سے بیٹھ جائے کہ ختم کر کے ہی اٹھے،اور پھر اس مجسمے میں اتنی کشش کیوں محسوس ہوتی رہی ہے؟ ایسا کیوں معلوم ہوتا رہا ہے کہ جیسے اسے اس سے کوئی قلبی لگاؤ ہو؟ اور اس سلسلے میں اتنے بہت سے سوال اس کے ذہن میں جمع ہوگئے کہ وہ خود ان کا کوئی جواب نہ تلاش کر سکا۔

ان چٹانوں کو عبور کرتا ہوا وہ اس ٹیلے کے نزدیک پہنچ گیا۔اور اس کا خیال صحیح نکلا۔ یہ وہی مقام تھا جو اس نے خواب میں دیکھا تھا۔گول سیڑھیوں والا وشنو استھان،وہ سیڑھیاں جو پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔کہیں کہیں زمین سے نکلی ہوئی اب بھی نظر آرہی تھیں اور یہ ممکن تھا کہ ان کا نچلا حصہ زمین کے اندر کافی دبا ہو۔نہ جانے کیوں اس ٹیلے پر قدم رکھتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔اوپر پہنچ کر وہ تھکن سی محسوس کرنے لگا۔اس نے اس خواب کے مطابق یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وشنو کی مورتی کا رخ کس طرف تھا،اور کس جگہ انداز اُوہ رقص کرتے کرتے جھکی تھی اور ملبے کے نیچے دب کر رہ گئی تھی۔

اس وقت اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی جب وہ اسی اندازے سے اس مقام پر بیٹھ کر اس مجسمے اور خواب والی لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا۔اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کا جسم ہلکا اور سر بھاری ہوا جا رہا ہو اور اس پر بے طرح غنودگی طاری ہونے لگی اور

آنکھیں کوشش کے باوجود بند ہوتی جارہی تھیں۔پھر اس پر چھٹے حواس کا عالم طاری ہوگیا۔ایک ایسی کیفیت جو بیداری وخواب کے بین بین ہو۔اور اس کیفیت میں اسے اپنی نیم وا آنکھوں کی دھندلاہٹ میں وہی خواب ایک واقعے کی شکل اختیار کرتا نظر آنے گا۔یہاں تک کہ وہ تمام آثار جو تقریباً نابود ہو چکے تھے، دوبارہ جی اٹھے۔ایلورا کی بستی آباد نظر آنے لگی۔ملبوں کے ڈھیر سمٹ کر مکانوں اور مندروں میں تبدیل ہوئے اور وہ جھاڑیاں جو جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں، حرکت میں آکر چلتے پھرتے انسان بن گئیں۔بالکل ویسے ہی جیسے اس نے خواب میں دیکھے تھے اور جیسے کچھ ان گفاؤں اور غاروں میں چٹانوں اور پتھروں پر منقش تھے۔پھر سب کچھ ویسا ہی ہوا۔وہی گھنٹے، وہی ناقوس، وہی شور وپکار، وہی زلزلہ اور پھر وشنو استھان کی طرف اپنی مخصوص محبوبانہ ادا سے آتی ہوئی وہی لڑکی۔اس کے گھنگھروؤں کی جھنکار اسے کانوں میں محسوس ہوئی۔اس پر اس وقت ایسی کیفیت طاری تھی کہ اس کے اندر جاگتے ہوئے شعورِ بیداری کی انتہائی کوشش بھی اس سکتے (spell) کو نہ توڑ سکی۔اور پھر اڑتی ہوئی چٹان، لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکا، کیونکہ پردۂ فلم تبدیل ہوتے ہوئے کسی منظر کی طرح چشمِ زدن میں وہ آبادی، وہ مکانات سب کھنڈروں میں تبدیل ہوگئے اور اس ویرانے کا بھیانک سکوت اور گہرا ہوگیا۔اس کی بے خودی اب بھی برقرار تھی۔اور وہ نیم غنودگی کے عالم میں سامنے دور تک پھیلی ہوئی ان چٹانوں کو دیکھ رہا تھا جن پر اس وقت اسے ایک سفید دھبہ نظر آرہا تھا۔اور اسے اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے وہ لڑکی، وہ مجسمے والی، وہ خواب والی لڑکی، سامنے دور، ان پرت دار چٹانوں پر ڈھلوان کی طرف چلی جارہی ہو۔بالکل اسی ادا سے، بالکل وہی اندازِ خرام۔ایک ہاتھ سے لہنگے کا سرا اوپر اٹھائے اور اس کا باریک سفید آنچل ہوا میں لہرا رہا تھا۔

''نینی...'' بے اختیاری کے عالم میں اس کے حلق سے یہ غیر مانوس سے الفاظ نکلے اور اس نے دیکھا، وہ تھم گئی، اس نے پلٹ کر دیکھا۔وہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔اور پھر وہ مسکرا کر آگے بڑھنے لگی۔ڈاکٹر مدن نے اپنے تئیں سر کو جھٹک کر اپنے حس سے لڑتے ہوئے

ہوش میں آنے کی کوشش کی، لیکن وہ غنودگی کے اس سلسلے کو نہ توڑ سکا۔ وہ آہستہ آہستہ اسی انداز سے چلتی ہوئی ڈھلوان کے اس سرے تک پہنچ رہی تھی، جہاں نشیب میں ایک پتھر کا مندر تھا، اونچا اور لمبا، لیکن اس کی باہر کی دیواروں کے کچھ حصے ٹوٹ چکے تھے۔ وہ اس مندر کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اس کے قریب پہنچ گئی۔ ڈاکٹر مدن نے ایک بار اپنی پوری قوت ارادی کو کام میں لاتے ہوئے سر کو جھٹکا اور پھر اپنا ایک ہاتھ خود اپنے دانتوں میں دبا لیا۔ تکلیف کے احساس نے جیسے جھٹکے کے ساتھ اس از خود رفتگی سے آزاد کر دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں پوری کھول دیں اور چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔ اس کی سمجھ میں خود نہ آسکا کہ ابھی ابھی اسے کیا ہو گیا تھا۔ اور پھر اچانک اس نے یاد کیا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ پرت دار چٹانوں پر، اس مندر نما غار کی طرف جاتی ہوئی وہی لڑکی۔ مگر اس وقت تو وہاں کچھ نہ تھا۔ وہ شاید اس غار تک پہنچ چکی تھی۔ مگر پہنچ کیا چکی ہوگی۔ وہ تو کوئی عالمِ تصور یا غنودگی کی تخلیق تھی۔ پھر بھی... اس نے اسے نینی کے نام سے پکارا تھا اور اس لڑکی نے اس پر اسے پلٹ کر دیکھا بھی تھا۔ آخر اسے اس کا نام کیسے معلوم ہو گیا۔ اس انجانی، ان دیکھی اور نامعلوم ہستی کا نام۔ کیا واقعی اس کا نام نینی تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ نام اس کے منہ سے نکلا کیسے؟ کیا آپ سے آپ؟

اس کی کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور محض یہ دیکھنے کے لیے کہ جس وجود کو اس نے عالمِ غنودگی میں ابھی اس مندر کی طرف جاتے دیکھا تھا، کہیں وہ اس کی ساتھی لڑکیوں میں سے یا دوسرے سیاحوں میں سے کوئی لڑکی تو نہ تھی۔ وہ اس مندر نما غار کی طرف چل دیا، جہاں بھیانک اجاڑپن چاروں طرف اپنا راج جمائے تھا۔

☆☆☆☆☆☆

# جھنکار

اس بوسیدہ پرانے مندر کے چاروں طرف اونچی اونچی جنگلی اگی ہوئی تھی، جس میں لمبی لمبی کئی ٹانگوں والے ٹڈے پھدک رہے تھے۔ اندر سے یہ مندر نما غار تقریباً ۶۰ فٹ لمبا تھا اور اس کی چھت بھی چالیس فٹ سے کم اونچی نہ تھی، جو اس میں تین طرف دیواروں اور ایک طرف کھلا برآمدہ تھا، جس کی چھت موٹے موٹے ستوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ ان کھمبوں پر کسی قسم کی نقاشی نہیں کی گئی تھی، صرف... جوڑ اس طرح لگائے گئے تھے کہ وہ شش پہل معلوم ہوتے تھے۔ اندر سے یہ غار سرد اور بڑا فرحت بخش تھا۔ چھت کا سامنے والا حصہ شکستہ تھا، مگر باقی چھت مکمل تھی۔ پچھلی دیوار میں تین محراب دار دروازے تھے، جن کے پیچھے جنگلی خودرو جھاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے اس غار کو جانوروں نے بھی اپنا مسکن بنانا پسند نہیں کیا ہو، کیوں کہ اس کا فرش گرد آلود ہوتے ہوئے بھی کسی قسم کی ایسی علامتوں سے پاک تھا۔ البتہ باہر برآمدے میں شاید جنگلی سیاروں نے کچھ گندگی پھیلائی تھی۔

پورا کھنڈر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ ابھی برآمدے سے گزر کر اندر قدم رکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسے اندر سے چھن چھناتے ہوئے گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی۔ وہی جھنکار جو اسے اس رات خواب میں سنائی دی تھی۔ اس کے کان اس جھنکار سے مانوس ہو چکے تھے۔ اس میں کچھ عجیب سی گونج ہوتی، کچھ اتنی پرکشش کہ اس کا دل کھنچنے لگتا۔ چھن چھن چھن... چھنا چھن... چھن چھن چھن... اور وہ سکتے میں آ گیا۔ کیا وہ...؟ مگر نہیں، وہم ہے اس کا۔ وہ جی کڑا کر کے اندر داخل ہو گیا۔ اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے کانوں کو گھنگھروؤں کی جھنکار اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ جیسے کوئی ناچ رہا ہو۔ وہ آواز اس سرے سے آ رہی تھی، جہاں ایک دیو پیکر مورتی تین سیڑھیوں کے ایک چبوترے پر کھڑی

ہوئی تھی۔اور وہ اتنی بڑی تھی کہ اس کا سر چھت سے ٹکرا رہا تھا۔اور اس کا... کی وہی تناسب سے تھا،اسے جس نے بھی تراشا ہو،مگر وہ ایک عظیم فن کار... سال پرانی ہو کر بھی اس کے نقوش،اس کی جسامت ایسی مکمل تھی جیسے واقعی کوئی زندہ وجود کھڑے کھڑے پتھر میں ڈھل گیا ہو۔اس کا انداز شیو کی بت جیسا تھا،لیکن نہ تو اس کے سر پر جوڑا تھا،جس سے گنگا پھوٹی ہو اور نہ بازوؤں پر سانپ۔پھر وہ کس کی ہو سکتی تھی۔اس کی شکل،اس کی بڑی بڑی پتھریلی آنکھیں،جن میں ابھری ہوئی پتلیاں دھنسی ہوئی تھیں۔اس کی خوبصورت ناک اور موٹے ہونٹ گوتم بدھ کے مجسموں سے بھی مناسبت رکھتے تھے،لیکن وہ بدھ کا مجسمہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔تو پھر وشنو کا ہو گا۔بہر حال کسی کا بھی ہو،وہ یا تو وہی بت تھا جو ڈاکٹر مدن نے عالمِ خواب میں اس پہاڑی پر ایستادہ دیکھا تھا یا پھر اسی کی دوسری نقل ہو گی۔بہر حال اس لمبے چوڑے غار میں پتھر کے اس بے جان،مگر جلال انگیز جسمے کا وجود دیکھنے والے پر اپنی ایک ہیبت،ایک رعب طاری کر دیتا تھا۔اس ہزاروں سال سے چھائے ہوئے بھیانک ویران سناٹے میں صدیوں سے اسی طرح کھڑا ہوا ایک پتھر کا دیوتا۔

مگر گھنگھروؤں کی جھنکار تو اسی طرف سے سنائی دے رہی تھی،جیسے کوئی نازک اندام رقاصہ والہانہ انداز میں رقص کر رہی ہو،اور در و دیوار تک مبہوت و غرقِ سکوت ہو گئے ہوں۔

اس کی حیران نگاہوں نے چاروں طرف ڈھونڈ ڈالا،مگر اس کی سمجھ میں نہ آسکا۔ گھنگھروؤں کی جھنکار مدھم پڑتی گئی۔ایسی جیسے ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی کوئی آواز زور چلی جا رہی ہو۔یہاں تک کہ اس مورتی کے پاس... پر وہ بالکل ہی معدوم ہو گئی۔

ڈاکٹر مدن سکتے میں آکر رک گیا۔اس کے کان اسے سن سکتے تھے۔اس نے خواب میں وشنو کے عظیم بت کے سامنے..ان گھنگھروؤں کی جھنکار صاف سنی جا سکتی تھی اور یہ... یہ بالکل ایسی ہی تھی۔

تو کیا...اس کی روح اب تک بھٹک رہی ہے؟ کیا وہ ابھی تک اسی طلسم عقیدت میں

قید ہے؟ مگر یہ بات کیا ہے آخر؟ وہ اپنے وجود کے آٹا راسی پر کیوں ظاہر کر رہی ہے۔ وہ مجسمہ اسی کے پاس تک کیوں پہنچا۔ وہ اس کے لیے اپنے دل میں ایک نامعلوم سا واسطہ کیوں محسوس کرنے لگا۔ وہ ایلورا کیوں آیا۔ وہ کیوں آیا؟ کیا یہ سب کچھ کسی آسیبی تعلق سے ہو رہا ہے؟ کیا وہ روح اس سے کوئی کام لینا چاہتی ہے؟ کیا وہ اسے جانتی ہے؟ اور کیا... کسی جنم میں اس کا اس سے کوئی رابطہ رہا ہے؟

''ہشت...'' اس نے سوچتے سوچتے خود ہی اپنا سر جھٹک دیا۔ وہ مذہبی آدمی نہ تھا۔ اس کا ذہن آج کے دور میں مفروضوں کو قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کرتا رہتا تھا۔ خواہ وہ مذہبی نوعیت کے ہوں، خواہ روایتی۔ اس کے باپ دادا سب فلسفہ تجدیدِ حیات (Re-incarnation) پر یقین کرتے آئے تھے، لیکن اس نے جس ماحول میں تعلیم پائی تھی، وہ کچھ اتنا ترقی پسند انہ تھا کہ اس میں ایسے یقین کی گنجائش نہ تھی۔

پھر بھی اسے اس مجسمے کی یاد بری طرح ستانے لگی اور اس کے تصور میں ایلورا کی وہ حسین دوشیزہ، وشنو کی وہ پری پیکر پجارن اس طرح ابھر آئی جیسے وہی اس کے تمناؤں کی روح ہو، جس کے لیے وہ ایک ان ہونی سی بات کا اشارہ کر رہا ہو۔ مثلاً یہ کہ کہیں نہ کہیں اسے مل جائے گی۔ وہ اسے قریب سے دیکھ سکے گا۔ وہ اس کے ...ہوئے نازک اور حسین جسم کو رقص کرتے ہوئے سامنے پالے گا۔ کیا ایسا ہو سکے گا؟ اس سے باتیں کر سکے گا؟ اور شاید کہ وہی اس کی روح کی پیاس ہو۔ وہ پیاس جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی، جو اسے نہ کرن کی موجودگی میں محسوس ہوئی تھی نہ پروین کی۔ اور نہ کسی اور خوبصورت سے خوبصورت لڑکی کے لیے۔

مگر اسی رو میں اسے رات اکاوشی کے رقص میں ناچتی ہوئی اس لڑکی کا خیال آ گیا، جو لباس سے مختلف، مگر انداز و شکل سے بالکل ویسی ہی تھی۔ وہ کون تھی آخر؟ وہ اسے پھر کیوں نظر نہیں آئی؟ ارے، مگر وہی تو اسے چٹانوں پر اس طرف آتی نظر نہیں آئی تھی؟ وہی تو

کہیں گھنگھرو پہنے ناچ نہ رہی ہو۔ وہ تو ایک زندہ وجود تھا۔ وہ اسے تو قریب سے دیکھ سکتا ہے۔ وہ اسے ضرور دیکھے گا، بلکہ یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ وہ اس مجسمے سے، اس کے خواب میں آنے والی ڈھائی ہزار برس پرانے ایلورا کی اس لڑکی سے اس قدر مشابہت کیوں رکھتی ہے۔ مگر وہ کیا جواب دے گی اس بات کا۔ مشابہت تو اکثر واقع ہو جایا کرتی ہے۔ دو شکلیں ایک جیسی مختلف ادوار میں پیدا ہوئی ہیں۔ بلکہ ایک ہی دور میں بھی دو مختلف مقامت پر ایک جیسی شکلیں دیکھی گئی ہیں۔

مختلف خیالات کا ایک ہجوم اس کے دماغ میں دھینگا مستی کرنے لگا۔ اور وہ پریشان ہو کر باہر نکل آیا۔ اسے نہ جانے کیوں اس غار سے ایک ڈر سا لگنے لگا تھا۔ باہر اس نے تمام کھنڈر دیکھ ڈالے، مگر وہاں تو کسی ذی روح کا پتہ نہ تھا۔ میدان اور چٹانیں سب ہی ویران پڑی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆

واپس لوٹتے ہوئے ایک ٹیلے کے قریب سے جب وہ گزر رہا تھا تو... کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ایک ویران مقام پر ایسی غیر متوقع آواز کو سن کر اس کا اچھل پڑنا قدرتی تھا۔ مگر جواب میں اسے ڈاکٹر دوبے کی آواز سنائی دی۔

''بھگا دیا نا آخر۔''

ڈاکٹر مدن نے دیکھا، ڈاکٹر دوبے ایک جھاڑی کے پاس گھاس پر اوندھا لیٹا ہوا گرگٹ کا شکار کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی جس میں گرگٹ کا پھندا لگا ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر مدن کو گھورتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''بھلا اتنی بھی عقل تو استعمال کی ہوتی۔'' وہ بڑبڑانے لگا۔ ''کتنی مشکل سے ایک نظر آیا تھا مجھے۔''

''کیا؟'' ڈاکٹر مدن نے سنجیدگی سے پوچھا۔اس کے چہرے پر ذہنی الجھن کے آثار اب تک نمایاں تھے۔

''گرگٹ۔'' ڈاکٹر دوبے نے جواب دیا۔

''یہاں ایک بورڈ لگوادو کہ محکمۂ حشراتیات کو ایسے گرگٹوں کی ضرورت ہے جو قدیم تاریخی نسلوں سے تعلق رکھتے ہوں۔امیدوار گرگٹ تمہارے پتے پر درخواست دیں۔'' ڈاکٹر مدن نے بتایا۔

''اور شاید سب سے پہلی درخواست تم ہی دو گے۔'' ڈاکٹر دوبے مسکرایا۔

''ہم تم تو ایک ہی نسل کے ہیں۔''

''اچھا رہنے دو اپنی تجویزیں، مجھے پھر سے کوشش کرنی پڑے گی۔'' ڈاکٹر دوبے یہ کہہ کر پھر اس جھاڑی کی طرف چلنے لگا۔

''ڈاکٹر، کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا، پتا نہیں کب لوٹوں گا میں۔'' ڈاکٹر دوبے نے پلٹ کر ڈاکٹر مدن سے کہا۔

''اپنا بھی یہی خیال ہے۔'' ڈاکٹر مدن یہ جملہ کہہ کر چل دیا۔

وہ پورے گاؤں میں گھومتا رہا، لیکن اسے اس شکل کی کوئی لڑکی نظر نہیں آئی۔اس کی یہ جرأت بھی نہ ہوئی کہ کسی سے اس کے بارے میں دریافت ہی کرے۔کوئی کیا سوچتا آخر۔مگر اتفاق سے اسے جوشی مل گیا۔وہ کسی مہاجن کے یہاں اپنے قرضے کا سود بھر کے آرہا تھا۔اس نے جب ڈاکٹر سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے اسے بتایا کہ وہ ایک ایسی لڑکی کی تلاش، میں ہے جس کا حلیہ ایسا ہے اور جو رات کو ان لڑکیوں میں ناچ رہی تھی۔''

مگر جوشی نے انکار میں سر ہلا دیا۔اس نے بتایا کہ اس گاؤں میں تو کوئی ایسی لڑکی نہیں ہے۔ہاں باہر سے کوئی مہمان آ گئی ہو تو پتا نہیں۔

بات ایسی ہی تھی جو رات اس ناچ میں شریک کسی لڑکی سے ہی معلوم ہو سکتی تھی۔

Akram Allahabadi

''مگر اس لڑکی کی تلاش کیوں ہے آپ کو؟'' جوشی نے پوچھا۔

''یہ ایک ایسی بات ہے جو تمہاری سمجھ میں نہ آئے گی۔ بس یوں سمجھ لو کہ ایک بالکل ویسی ہی لڑکی اب سے ڈھائی ہزار سال پہلے گزر چکی ہے اور اسی لیے مجھے اس کی تلاش ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''بات تو یہ بھی میرے پلے نہیں پڑی۔'' جوشی سر کھجلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ٹھہریے، آج چودھری کی چوپال کے سامنے فصل کی نندائی ہو رہی ہے۔ وہاں گاؤں کی بہت سی چھوکریاں اکٹھی ہوں گی۔ ان میں سے دیکھ کر پہچان لیجیے۔'' وہ بولا۔

''لیکن گاؤں والے؟''

''ان کی فکر نہ کیجیے۔ وہ شہر والوں کی طرح شکی مزاج نہیں ہوتے۔''

''تو چلیے۔''

جوشی اسے چودھری کی چوپال پر لے آیا۔ یہاں چوپال کے سامنے کٹی ہوئی فصل کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور گاؤں بھر کی لڑکیاں اور عورتیں اسے دھنکنے اور نندنے میں لگی ہوئی تھیں۔ چودھری نے شہری مہمان کا خود استقبال کیا اور چوپال کے سامنے اسے چارپائی پیش کر کے حقہ سامنے رکھ دیا۔

''ڈاکٹر صاحب کھیتی باڑی کے کاموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے فصل کی نندائی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔'' جوشی نے چودھری کو بتایا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ اور شہر والوں کے لیے تو یہ سب سننے کی باتیں ہوتی ہیں، آنکھوں دیکھے سے ہی پتا چلتا ہے کہ کسانوں کو پیٹ بھرنے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔'' چودھری سر ہلا کر بولا۔

مگر ڈاکٹر غور سے ان لڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے ان میں ایک بھی چہرہ نظر نہ آیا جو اس لڑکی سے مشابہت بھی رکھتا ہو، جسے اس نے کل رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس

نے جوشی کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

اور بھی جگہیں نہیں چھوڑی گئیں۔ کنوؤں کی جگت پر، گھاٹ پر اور کھیتوں میں بھی، مگر وہ چہرہ اسے کسی لڑکی میں نظر نہیں آیا۔

وہ جب لوٹ کر قیام گاہ پر آیا تو سب واپس آ چکے تھے اور ڈاکٹر مدن کا ہی انتظار کیا جا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب سے پہلے مرزا جی چہکے۔

''اجی واللہ، ہم تو سمجھے تھے کہ کہیں آپ راستہ بھٹک گئے۔''

''جی نہیں، کل سے آپ کی انگلی پکڑ کر چلا کروں گا۔'' ڈاکٹر مدن نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

کرن خود اس کے قریب آ گئی۔ وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی، مگر ڈاکٹر دوبے کو نہ اس کے آنے سے واسطہ تھا نہ جانے سے۔ انھیں کوئی تاریخی گرگٹ تو نہیں ملا تھا، البتہ ایک گھوڑے جیسی شکل کا چھوٹا سا کیڑا ضرور پکڑ لائے تھے۔ اس کا سر واقعی گھوڑے جیسا تھا اور باقی جسامت پتلی ٹانگوں والے کیڑوں جیسی۔ یہ ان سبز ٹڈوں سے علاحدہ شکل رکھتا تھا جو برسات کے بعد سبز گھاس میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر دوبے اسی کو اسٹیڈی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر مدن کی طرف توجہ بھی نہ کی جب وہ کسی ایسی دھن میں ہوتے تھے تو اپنے آپ کو بھی بھول جاتے تھے۔

''آپ نے ابھی تک کھانا بھی نہ کھایا ہوگا۔'' کرن نے پوچھا۔

''کھایا تو واقعی نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بھوک بھی نہیں لگی تھی۔'' ڈاکٹر مدن نے بتایا۔

''اور اب؟'' اس نے پوچھا۔

''ضرور کھاؤں گا، بلکہ اس وقت تو اتنی بھوک لگی ہے کہ کھانا پکانے والے کو بھی کھا جاؤں گا۔''

Akram Allahabadi

''تو پھر میں نے ہی پکایا ہے۔'' وہ ہنس پڑی۔

''تب تو معاف کیا۔'' ڈاکٹر بھی ہنس دیا۔اور کرن کے چہرے پر ایک لمحے پہلے جو اداسی چھائی ہوئی تھی، وہ کافور ہوگئی۔وہ اس خوشگوار گفتگو کے بعد بشاش نظر آنے لگی۔

''آپ کدر چلا گیا تھا، ڈاکٹر صاحب؟'' جمشید جی نے بھی اظہارِ تعلق کے طور پر اس سے پوچھا۔

''میں نے ایک عجیب بات دیکھی ہے آج۔'' ڈاکٹر مدن نے بتایا۔

''وہ کیا؟'' پروین بھی جلدی سے متوجہ ہوگئی۔

اور جواب میں ڈاکٹر نے آج کا واقعہ انھیں سنا دیا۔البتہ اس نے یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ لڑکی جو اسے چٹانوں پر نظر آئی تھی، اس کے پاس موجود مجسمے سے ملتی جلتی تھی، یا اس کے خواب میں آئی ہوئی ایلورائی دیوکنیا سے بالکل مشابہت رکھتی تھی۔اس نے ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کیا، صرف اسی قدر بتایا کہ اسے اس ٹیلے پر بیٹھ کر عالمِ غنودی میں کچھ ایسے مناظر نظر آئے تھے۔پھر چٹانوں پر وہ لڑکی دکھائی دی اور جب اس کی کھوج میں اس غار میں داخل ہوا تو اسے وہاں پائل کی جھنکار سنائی دی۔

''ضرور ان کھنڈروں میں آسیب ہے۔'' مرزا جی فوراً بول پڑے۔اور چوبے جی صرف سن کر ہی خوفزدہ نظر آنے لگے۔ایسے معاملات میں وہ بڑے زودِاعتقاد واقع ہوئے تھے۔مگر جمشید جی اور پروین تو اسے مذاق ہی سمجھ رہے تھے۔اور خود کرن بھی اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔ڈاکٹر مدن نے انھیں یقین دلانے کی کوشش بھی نہ کی۔اس نے تو صرف ایک واقعہ بیان کر دیا تھا۔

مگر جوشی نے ایلورا کے کھنڈروں کے بارے میں جو گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے سنی ہوئی آسیبی روایات بیان کی تھیں، انھیں وہ بھی بھولے نہ تھے۔خصوصاً ایلورا کی ہولناک راتوں کے بارے میں۔

Akram Allahabadi

اوراس لیے ڈاکٹر مدن کا بیان کیا ہوا واقعہ انھیں اس شبہے میں ڈال رہا تھا کہ کہیں واقعی وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہی نہ ہو۔

ڈاکٹر مدن تو اپنے کمرے میں چلا گیا، مگر کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد تقریباً سب ہی نے اس بات کو محض اس لیے بھلا دیا کہ اگر ایسا ہو بھی تو انھیں اس سے واسطہ ہی کیا۔ وہ تو صرف سیاحت اور تفریح کے لیے آئے تھے۔ وہ ڈاکٹر مدن پر اگر کوئی جھک سوار تھی تو وہ اس کا اپنا تعلق تھا، کسی کو کیا۔ البتہ کرن سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر آج کچھ پریشان ضرور تھا، کیوں؟ یہ وہ نہ جانتی تھی، مگر ہو سکتا ہے اس کی پریشانی کا سبب یہی واقعہ رہا ہو۔ اور اس فکر کے ساتھ وہ ڈاکٹر مدن کی ہر حرکت کا مطالعہ کرنے لگی۔

ڈاکٹر کو ذہنی سکون کی ضرورت تھی، اس لیے وہ بہت مختصر سا کھا کر اپنے کمرے میں ایسا سویا کہ جیسے کئی دن سے بے خواب رہا ہو۔

دوسرے دن صبح ایک عجیب بات ہوئی۔ صبح صبح جب وہ سو کر اٹھے تو ڈاکٹر مدن غائب تھا۔ سب کو اس کی فکر لاحق ہو گی۔ کیونکہ کل اس کی زبان سے وہ ایک عجیب سا واقعہ سن چکے تھے۔ ناشتہ کیے بغیر وہ اس کی تلاش میں نکل پڑے۔ جوشی بھی ساتھ میں تھا۔

شب خوابی کے لباس میں بالآخر وہ انھیں ایلورا کے غاروں کے پیچھے ڈھلوان چٹانوں سے قریب ایک جگہ کھنڈر میں پڑا ملا۔ وہ یا تو نیند میں تھا یا بے ہوش۔ اور وہ اسے اٹھا کر لے آئے۔

ڈاکٹر مدن نے جب آنکھیں کھولی وہ چاروں طرف سے اسے گھیرے ہوئے تھے۔

''ارے، کیا ہو گیا تھا آپ کو؟'' مرزا جی نے جلدی سے پوچھا۔

''تم گئے کہاں تھے؟'' ڈاکٹر دوبے نے بھی سوال کیا۔

''مم... میں... کہیں تو نہیں۔'' ڈاکٹر مدن نے چونک کر جواب دیا۔ اور وہ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

''مگر ہم تو تمہیں ایلورا کے کھنڈروں سے اٹھا کر لائے ہیں۔تم رات سے غائب تھے۔''ڈاکٹر دوبے نے کہا۔

''کیا...؟''ڈاکٹر اٹھ بیٹھا۔شاید اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ ہوا ہے۔وہ سر کو تھامے ہوئے کچھ دیر تک سوچتا رہا۔پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''ممکن ہے تم خواب میں ہی چل کر کہیں گئے ہو؟''ڈاکٹر دوبے نے کہا۔

''اوہ...یس...سلیپ واک۔''جمشید جی بھی بولے بغیر نہ رہے۔

''ارے نہیں...یہ سب اسی آسیب واسیب کا اثر ہوگا۔''چوبے جی جلدی سے بول اٹھے،مگر ڈاکٹر مدن ان کے تبصرے سے بے نیاز ذہن پر زور دے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔پھر وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔شاید وہ تنہائی چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی کرن بھی آ پہنچی۔وہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔

''آپ کو ضرور کچھ ہوگیا ہے۔آپ جب سے یہاں آئے ہیں پریشان نظر آرہے ہیں۔''

''میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ کوئی ایک بڑا عجیب سا واقعہ ظہور پذیر ہو رہا ہے۔''

''مگر آپ کسی کو کچھ بتانے بھی تو نہیں؟''

''ایسی باتیں نہیں جو بتائی جاسکیں اور میں خود بھی انھیں ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہوں۔''

''کیا مجھے بھی نہیں بتائیں گے آپ؟''کرن کا لہجہ ایک محبوبانہ اصرار لیے ہوئے تھا۔

''کوئی فائدہ نہیں،تم بھی نہ سمجھ سکو گی۔''

''چلیے میں نہ سمجھ سکی،مگر مجھے بتا کر کم از کم اپنے دل و دماغ کا بوجھ تو ہلکا کر لیجیے۔''

''کیا تم یقین کرو گی کہ ایلورا کی سرزمین پر اب سے ڈھائی ہزار سال پہلے جو واقعہ

ہوا تھا وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟''

''کیا مطلب؟'' وہ حیرت زدہ لہجے میں بولی۔

''اب سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے جب ایلورا کے شہر میں پچھی آئی سے بھی زیادہ خوفناک زلزلہ آیا تھا، میں وہاں موجود تھا۔'' ڈاکٹر کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آ...آپ کو ضرور کچھ ہو گیا ہے۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تم نہ سمجھ سکو گی۔''

''مگر آپ رات کو کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''مجھے خود معلوم نہیں، مگر اتنا یاد آ رہا ہے، جیسے...اوہ ہاں...کل رات تاریک سناٹے میں وہ...میرے کمرے میں آ پہنچی تھی۔''

''کون...؟ پروین...؟''

''اوہ نہیں، نینی، ایلورا کی دیوکنیا۔''

''دیوکنیا...؟ ایلورا کی...؟ نینی...؟'' کرن حیران زدہ ہو کر بولی۔

''ہاں۔ تم نہیں سمجھ سکتیں، مگر وہ آئی تھی۔'' ڈاکٹر کسی داستان گو کے انداز میں کہنے لگا۔

''میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا مگر ابھی نیند کچی ہی تھی کہ مجھے اس کے گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ وہ دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔ اور مجھے اپنی طرف دیکھتے ہی باہر نکل گئی۔ میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ کئی دنوں سے میں اس کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے لیے پریشان ہوں۔ میں اسی عالم میں اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ وہ مجھے اپنے پیچھے پیچھے ایک کھنڈر تک لے گئی۔ میں دن کے وقت اس کھنڈر کے پاس سے گزرا ہوں۔ دن میں تو بالکل اجاڑ پڑا تھا، مگر اس وقت وہاں کافوری شمعیں جل رہی تھی۔ پھر جانتی ہو اس نے وہاں کیا کیا؟''

''کیا؟''

''وہ وہاں ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور میں حیران سا کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ بڑی بے چارگی کی نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

''کیا تمہیں کچھ بھی یاد نہیں آتا؟'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر اس نے ایک طرف کی دیوار کے ایک طاق کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا یہ بھی نہیں؟ یہیں تو رتمہارا سر کاٹ کر رکھا گیا تھا۔''

میں اس عجیب انکشاف سے کانپ کر رہ گیا۔ مگر نہ جانے کیوں، پر مجھے محسوس ہونے لگا جیسے واقعی میں اس مقام سے مانوس ہوں۔ مگر نہ جانے کب۔ یہ کھنڈر ایک بڑا سا پتھر کا مکان تھا اور میں یہاں آچکا ہوں۔ ممکن ہے کئی بار۔ اور پھر اس ٹوٹے ہوئے طاق کو دیکھ کر مجھے ایک جھرجھری سی آ گی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''یاد ہے تمہارا سر راجا نے کیوں کٹوایا تھا؟''

اور میں نے بے چارگی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

''اوہ، تم سب کچھ بھول چکے ہو۔ حالانکہ جس... جس کے لیے تم نے اتنی عظیم قربانی دی تھی۔'' وہ خود ہی بتانے لگی۔ ''وہ کچھ نہیں بھولی۔ مجھے تمہاری ایک ایک بات یاد ہے۔ مجھے تمہارے وہ الفاظ بھی یاد ہیں جو تم نے میرا مجسمہ تراشتے ہوئے کہے تھے۔ تم نے کہا تھا، راجا چاہے میرے بیس ٹکڑے کرا دے، میں تمہاری مورتی ضرور بناؤں گا، اور میں نے کہا تھا، مورتیاں صرف راجاؤں اور دیوی دیوتاؤں کی بنائی جاتی ہیں۔ اس پر تم بولے تھے کہ 'میں بھی تو تم کو پوجتا ہوں۔ تم میرے من مندر کی دیوی ہو۔ من کا مندر جو سنسار کے تمام مندروں سے بڑا ہے۔ میں ضرور بناؤں گا'۔ مگر پھر بھی تم نے راجا کے ڈر سے میرا چھوٹا سا مجسمہ ہی تراشا تھا اور اس کی خبر راجا کو ہو گئی۔ یاد آ رہا ہے تمہیں؟''

''ہاں۔ اور... اور راجا نے میرا سر... یہ کہتے ہوئے بے اختیار میرا ہاتھ اپنی گردن پر

چلا گیا۔اور اس کے ساتھ ہی نہ جانے کیوں مجھے ایک جوش سا آ گیا۔ میں بگڑ کر بولا، راجہ کو کیا حق تھا کہ وہ تمہیں اپنی پیدائشی جاگیر سمجھے۔تم تو دیوی ہو.....میں عالمِ بے خودی میں کہتا گیا۔''

''تو تمہیں یاد آ رہا ہے۔''وہ کھل اٹھی،''میں جانتی تھی کہ تم وہی ہو۔

''کک...کون؟''میری زبان لڑکھڑانے لگی۔مجھے جیسے ہوش سا آ گیا۔.....

''مگر...جوتیما...''اس نے بے ساختہ مجھے پکارا...اور...میرے قدم آپ سے آپ رک گئے۔سچ مانو۔میرے رکتے ہی وہ قہقہے مار کر ہنس پڑی۔

''تم مجھے دھوکا دینا بھی چاہو تو اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔تم جوتیما ہو، ایلورا کے عظیم بت تراش۔تم نے میرے لیے عیاش راجا سے ٹکر لی تھی۔تم نے بھرے دربار میں راجا کو للکارا تھا کہ دیو کنیا راجا کے عشرت کدے میں نہیں ناچے گی، وہ صرف وشنو دیوتا کے سامنے ناچتی ہے۔وہ دیو کنیا ہے اور راجا اس بات پر تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا، مگر جب تم نے میرے پیار کی خاطر میری مورتی تراشی تو اسے خبر ہو گئی اور اس نے اسی قصور پر تم سے بدلہ لے لیا۔اس نے تمہارا سر کٹوا کر میرے ہی گھر کے طاق میں رکھوا دیا۔آہ...جوتیما...تم کتنے پیارے ہو، کتنے پیارے ہو...کتنے عظیم۔''

وہ کہتی رہی اور میں اس طرح سنتا رہا جیسے یہ سب کچھ میرے ہی بارے میں کہا جا رہا ہو۔تم یقین مانو وہ تمام مناظر میری نظروں میں گھومنے لگے تھے۔مگر جب مجھے اپنی کٹتی ہوئی گردن کا خیال آیا تو میں چیخ پڑا۔اور پھر مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔''

''اوہ..تو وہی کھنڈر تھا۔''کرن نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کونسا کھنڈر؟''

''جہاں سے ہم آپ کو اٹھا کر لائے تھے، مگر واقعی بڑا بھیانک خواب تھا۔''

''خواب...؟ کرن، تم یقین مانو یا نہ مانو، مجھے تو اب بھی ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے وہ

سب کچھ سچ تھا۔جیسے میں...میں ہی جو تیا ہوں۔''

ڈاکٹر مدن کے اس بیان پر کرن سٹپٹا گئی۔اس کے ذہن میں فوراً یہ خیال پیدا ہوا کہ ڈاکٹر دوبے کو ڈاکٹر مدن کی اس ذہنی کیفیت سے آگاہ کر کے یہاں سے فوراً واپس چلنے پر آمادہ کرے۔وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اچھا، آپ چائے پی لیجیے، میں تب تک جوشی کے نوکر سے آپ کے غسل کے لیے پانی گرم کرائے دیتی ہوں۔'' یہ کہتی ہوئی وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

مگر ڈاکٹر دوبے نے اس کی تجویز رد کر دی۔

''تم کیا سمجھو گی اسے، میں جانتا ہوں۔وہ قطعی صحیح الدماغ آدمی ہے۔اس نے ہمیں پریشان کر کے لطف لینے کے لیے کوئی گہرا مذاق کیا ہوگا۔'' وہ بولا۔

''مگر، ڈیڈی، میں نے خود ان کی کیفیت دیکھی ہے۔''

''بچوں جیسی باتیں نہ کرو، کرن۔یہاں حشرات الارض کے لیے بڑا اچھا مواد موجود ہے۔میں ایک ہفتے سے پہلے یہاں سے نہیں جا سکتا۔'' ڈاکٹر دوبے نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور کرن یہ جان کر کہ اب کچھ کہنا بے سود ہے، خاموش ہو گئی۔مگر اس کا دل کسی قیمت پر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ ڈاکٹر مدن کوئی گہرا مذاق کر رہا ہے۔اس نے ان باتوں کا ذکر کسی اور سے نہیں کیا، کیونکہ وہ لوگ پہلے ہی کافی توہم پرست واقع ہوئے تھے۔البتہ پروین کو اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔اور اسے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ پروین اس سے متاثر ہونے کے بجائے قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

''ضرور ڈاکٹر مدن کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' وہ بولی۔

کرن کو اس کا یہ جملہ اتنا برا لگا کہ وہ اس سے کوئی اور بات کیے بغیر اٹھ کر آ گئی۔

☆☆☆☆☆☆

# عکسِ رقصاں

وہ جانتا تھا کہ سب کی نگاہیں اسی پر لگی ہوئی ہیں۔ان میں صرف ڈاکٹر دوبے ہی نہیں تھا، کیونکہ وہ اپنا گرگٹ کا پھندا لے کر بیگ بغل میں لٹکائے ناشتے کے بعد ہی نکل گیا تھا۔مگر برآمدے میں ہی کرن بیٹھی تھی اور اس کی نظر ڈاکٹر کے دروازے کی طرف ہی تھی۔ایک بار جب وہ کپڑے پہن کر دروازے تک آیا بھی تو کرن نے ہی اسے یہ کہہ کر لوٹا دیا تھا کہ آپ کو پریشان کن خواب آرہے ہیں، آپ آرام کیجیے۔ایسے میں باہر جانا ٹھیک نہیں ہے۔اس نے کرن کی آنکھوں میں دیکھا۔ان میں بلا کی اپنائیت اور بے پناہ ہمدردی کے جذبات نمایاں تھے۔وہ اس سے ضد نہ کر سکا اور لوٹ آیا۔مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے رات کے واقعات یاد آتے گئے۔وہ مجسمہ، وہ لڑکی۔اس کا دل نہ جانے کیوں اسے ایک بار پھر دیکھنے کے لیے تڑپ اٹھا۔اس کے کانوں میں گھنگھروؤں کی وہی رسیلی جھنکار گونجنے لگی۔مگر جب اس نے گھوم کر دیکھا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مدھم مدھم جھنکار کھلی کھڑکی کے باہر کہیں دوران کھنڈروں کی طرف سنائی دے رہی ہے۔وہ اٹھا اور کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا۔اس طرف سناٹا تھا۔

ایلورا کے غاروں اور کھنڈرات میں بھٹکتا ہوا وہ ذہنی سکون کی تلاش میں پھر ایک بار اسی ٹیلے پر جا پہنچا جہاں گول سیڑھیا کہیں کہیں زمین سے نکلی دکھائی دیتی تھیں۔

نہ جانے کب تک وہ یہاں بیٹھا رہا۔یہاں تک کہ سورج سر پر آگیا اور اس کی تمازت ناقابلِ برداشت ہونے لگی۔وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اسے رقص کرتے ہوئے گھنگھروؤں کی مدھم مدھم جھنکار سنائی دینے لگی۔جیسے آوارہ ہوائیں کہیں دور انجانی دنیا سے کسی کا پیغام لا رہی ہوں۔اور اسے ایک بہت مدھم سی آواز اپنے کانوں میں سرگوشی کرتی سنائی دی۔

''جوتیما،تم ضرور آؤ گے...تم ضرور آؤ گے، جوتیما۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بے اختیار اس کے قدم پرت دار چٹانوں کو روندتے ہوئے اس کھنڈر کی طرف بڑھنے لگے جہاں شیو یا وشنو کا دیو قامت بت ایستادہ تھا۔

گھنگھروؤں کی جھنکار تیز ہوتی جا رہی تھی اور اسی طرح اس کی رفتار۔مگر وہ جیسے ہی اس مندر نما غار کے شکستہ برآمدے میں داخل ہوا، گھنگھروؤں کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔وہ تیزی سے اندر گھس گیا، مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔صرف وہی دیو پیکر مجسمہ اپنی مستقل اور سنگین خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا تھا۔کچھ دیر تک وہ اس کے سامنے کھڑا اسے تکتا رہا۔پھر یہ سوچ کر کہ آواز کہیں اس کھنڈر سے نہ آئی ہو جہاں رات وہ لے جایا گیا تھا۔اس نے لوٹ کر برآمدے میں قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک پھر وہی جھنکار گونج اٹھی۔جیسے کوئی رقص کر رہا ہو۔وہ پھر ٹھٹک کر رک گیا اور وہیں سے اندر جھانکنے لگا۔گھنگھروؤں کی آواز اب بھی آ رہی تھی، مگر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔اور دوبارہ جب وہ اس ہال نما حصے میں داخل ہوا تو وہ جھنکار پھر اس طرح رک گئی جیسے کوئی ریڈیائی سلسلہ اچانک منقطع ہو جائے۔وہ حیران حیران سا غار کے بیچ و بیچ کھڑا چاروں طرف دیکھنے لگا۔اس جھنکار کو سن لینے کے بعد اس کے دل کی بیقراری اور بڑھ گئی۔

''نینی...'' وہ بے اختیار چیخا۔''میرے سامنے آؤ، نینی۔میں بہت بے قرار ہوں۔''

اور اس کی آواز اس ویران غار کی نیم شکستہ دیواروں سے ٹکرا کر رہ گئی۔

جواب میں گھنگھرو صرف تین بار چھنکے اور پھر آواز معدوم ہو گئی۔

''آ جاؤ، نینی، میں بہت بے چین ہوں۔میں پاگل ہو جاؤں گا۔''اس بار اس کی آواز بھرائی ہوئی اور دردناک تھی۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ڈاکٹر مدن کے اندر سے کوئی اور بول رہا ہو۔

اور اس بار گھنگھرو صاف چھنکنے لگے اور پھر ان کی کھنکار سے ایک باقاعدہ رقص شروع ہو گی۔وہ وہیں حیران سا کھڑا تھا، مگر صرف جھنکار سنائی دے رہی تھی، کوئی نظر نہیں آ رہا

Akram Allahabadi

تھا۔

''سامنے آؤ، منی ۔نہیں تو میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔'' وہ چیخا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس دیو پیکر بت کے سامنے رقص کرتا ہوا ایک عکس نمودار ہوا اور والہانہ انداز میں تھرکتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ اس بت کے بجائے اس کے سامنے آ کر ناچنے لگا۔وہ وہی تھی...دیوکنیا... منی... مجسمے کی روح۔ڈھائی ہزار سال پرانے ایلورا کی حسین ترین دوشیزہ۔وہ سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔وہ رقص کرتی رہی۔کتنا پراثر اور پرکشش انداز رقص تھا۔جب وہ لہراتی تو ایک برقی لہر سی بدن کے تمام جسم میں سرایت کر جاتی۔جب وہ مسکراتی تو اسے وجد سا آنے لگتا۔

پھر اسے گھنگھرو کی سی ایک باریک آواز سنائی دی۔

''آج میں تمہارے لیے ناچ رہی ہوں، میرے دیوتا۔آج ڈھائی ہزار برس کے بعد میری وہ آرزو پوری ہو رہی ہے جس کے لیے میں اب تک بیقرار تھی۔آج میں خوب ناچوں گی۔خوب...اتنی کہ کبھی عظیم دیوتاؤں کے سامنے بھی نہیں ناچی تھی، کیونکہ میرے لیے تم سے بڑا دیوتا کوئی نہیں۔تم نے میرے لیے اپنا سر کٹایا تھا۔''

اور اس آواز کے ساتھ اس کا رقص دوبارہ شروع ہو گیا۔اس کے نقرئی گھنگھروؤں کی جھنکار اس غار میں گونجتی رہی اور ڈاکٹر مبہوت سا کھڑا رہا۔پھر وہ آگے بڑھ کر اس دیو پیکر بت کے قدموں میں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔اور وہ ناچتی رہی۔نہ جانے کب تک، وہ اپنے رقص میں کھوئی اور مدن اس کے جلووں میں۔

اچانک گھنگھروؤں کی آواز رک گئی اور غار میں سناٹا چھا گیا۔مدن محویت سے چونک پڑا۔اس کے سامنے کرن کھڑی اسے حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

''میں نے اپنے کانوں سے سنی ہے گھنگھروؤں کی جھنکار۔یہاں کون ناچ رہا تھا؟'' اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

Akram Allahabadi

''کوئی نہیں، مگر تم میرے پیچھے کیوں پڑی ہو؟'' ڈاکٹر نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسے یہ مداخلت اس قدر ناگوار گزری تھی کہ کوئی اور ہوتا تو وہ اس کے سر پر پتھر کھینچ مارتا۔

''میں آپ کو لینے آئی ہوں۔''

''اور میں بھی۔'' باہر سے مرزا جی کی آواز سنائی دی۔ وہ شاید آہستہ چلتے آ رہے تھے اور کرن دوڑ کر آئی تھی۔

''میں خود آ سکتا تھا، کیا ضرورت تھی اس کی؟''

''ارے واہ، آپ آدمی ہیں یا پاجامہ۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور بھٹک رہے ہیں غاروں میں۔'' مرزا جی نے یہ کہہ کر زبردستی اس کی بغل میں ہاتھ ڈال دیا۔ ڈاکٹر مدن کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر کرن کی طرف دیکھ کر کچھ نہ کہہ سکا۔ کرن کی آنکھوں میں آنسوں چھلک پڑے تھے۔

وہ ان کے ساتھ ہو لیا۔ مرزا جی اپنے بڑھاپے کی وجہ سے ساتھ نہیں چل سکے، پیچھے رہ گئے، لیکن کرن اس کے ہم قدم تھی۔

''مجھے افسوس ہے، کرن۔ میں اس وقت ذہنی انتشار کے عالم میں تھا۔'' ڈاکٹر نے چلتے چلتے اس سے معذرت کی۔

''میں جانتی ہوں۔'' کرن نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی پلکوں میں نمی اب تک باقی تھی۔

''کرن، برا نہ ماننا، میں تمہارے جذبات سے ناواقف نہیں ہوں، لیکن...'' وہ چلتے چلتے رک گیا۔ کیونکہ کرن کے آنسو پھر پھوٹ پڑے تھے۔ مرزا جی عقلمند تھے جو معاملے کو سمجھ کر دوسرے ہی راستے چل دیے۔

''دیکھو نا، تم سمجھتیں کیوں نہیں۔'' وہ اس کے دونوں ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

''میں اپنی بدنصیبی کو خوب سمجھ چکی ہوں۔'' کرن سسکیاں لے کر بولی۔

Akram Allahabadi

''کرن، ایشور کے لیے مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دو۔''

''یہی نا کہ آپ میرے نہیں ہو سکتے۔ میں بچپن سے اب تک ایک سپنا دیکھتی رہی تھی، مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کی تعبیر اتنی بھیانک نکلے گی۔'' وہ آج سب کچھ کہہ ڈالنے پر اتر آئی۔

''اف، میں کیسے سمجھاؤں تمہیں۔'' ڈاکٹر پریشان ہو گیا۔

''اگر میں آپ کے دل میں جگہ نہیں پا سکتی تو کیا ان چرنوں کی داسی بھی نہیں بن سکتی؟'' یہ کہتے ہوئے فرطِ جذبات سے کرن نے اس کے قدموں میں جھکنا چاہا ہی تھا کہ ڈاکٹر نے اسے بازوؤں سے تھام کر بھینچ لیا۔ وہ اس کے چوڑے سینے سے ٹک کر سسکیاں لینے لگی۔ اور ڈاکٹر ایک عجیب کشمکش میں کھو گیا۔

''ون مور پوز، پلیز۔'' انھیں اچانک پروین کی آواز نے چونکا دیا۔ اور جب انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ایک جھاڑی کی اوٹ سے نکل رہی تھی۔ کیمرہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ محجوب سے ہو گئے۔

''آخر میدان مار لیا نا تم نے؟'' وہ انگریزی میں کرن سے بولی۔ اور قدرتی طور پر کرن کو شرما جانا پڑا۔

ڈاکٹر البتہ گھبرا گیا تھا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔

بات اور بڑھنے بھی نہ پائی۔ کیونکہ چند قدم چلنے پر ہی انھیں ڈاکٹر دوبے کا پرجوش نعرہ سنائی دیا۔

''خبردار، دوسری طرف سے، یہ میری شکارگاہ ہے۔''

اور انھوں نے چونک کر دیکھا، داہنی سمت ایک ٹیلے پر وہ بڑے پرمسرت انداز میں پھندے میں ایک تقریباً دم سمیت اٹھارہ انچ لمبا گرگٹ پکڑے کھڑا تھا۔

''میں نے کہا نہ تھا ڈاکٹر کہ یہاں مجھے بڑی پرانی نسلوں کے حشرات میں ملیں

گے۔'' وہ ٹیلے سے اترتے ہوئے بولا۔

''یہ اسٹیگو سارکا بھی باپ ہے۔'' وہ گرگٹ کو بڑی فخریہ نظروں سے گھور کر بڑبڑایا۔

ڈاکٹر مدن صرف مسکرا کر رہ گیا اور سب ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

☆☆☆☆☆☆

آج کرن اس کے سامنے تمام وقت شرمائی سی رہی، لیکن اسے دیکھ کر ہر بار ڈاکٹر مدن کے چہرے پر کشمکش کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ رات کو کھانے پر بھی جب وہ یکجا تھے تو پروین انھیں دیکھ کر مسکرانے لگی اور دوسری طرف مرزا جی کے ہونٹوں پر بھی ایک بھدی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیا معاملہ ہے؟'' چوبے جی نے یہ دیکھ کر ان سے آہستہ سے پوچھا۔

''بڑا خطرناک۔'' وہ دبی زبان سے بولے۔ ''ڈاکٹر دوبے نے تو ۱۸ انچ کا گرگٹ ہی شکار کیا ہے، مگر ڈاکٹر مدن نے تو پانچ فٹ کا جانور مار لیا۔'' مرزا جی نے کرن کی طرف اشارہ کر کے چوبے جی سے کہا اور چوبے جی کی ہنسی جو چھوٹی تو نوالہ منہ سے باہر اور لقمہ ہو گیا۔

سب لوگ ان کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر مرزا جی کو ہی بہانہ بنانا پڑا کہ کھانا کھاتے میں اتفاق سے ان کی کہنی چوبے جی کے پیٹ میں لگ گئی تھی اور چوبے جی گدگدی کے مریض واقع ہوئے ہوئے ہیں، صرف انگلی دکھا دو تو کئی منٹ تک ہنستے رہتے ہیں۔''

کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ پروین اور کرن ایک ہی کمرے میں سوتی تھیں، اس لیے پروین اسے رات گئے تک ستاتی رہی۔

☆☆☆☆☆☆

رات آدھی ہو رہی تھی، لیکن ڈاکٹر مدن کو نیند نہیں آئی۔ وہ ذہنی طور پر قطعی بے سکون

Akram Allahabadi

تھا۔کبھی اس کی آنکھوں میں کرن آ کھڑی ہوتی اور کبھی اس ے کانوں میں گھنگھرو بجنے لگتے۔وہ عجیب شش و پنج میں مبتلا تھا۔کرن سے اسے محبت نہ بھی سہی،تب بھی وہ اس کے جذبات کو سمجھتا تھا۔وہ اگر بعقل وہوش کسی کو اپنی شریکِ حیات کے لیے منتخب کرسکتا تو اب وہ کرن ہی ہوتی،مگر یہ وہ ڈاکٹر مدن کی حیثیت سے سوچتا اور جب اس پر نامعلوم طور پر یہ تصور حاوی ہونے لگتا کہ وہ ڈھائی ہزار برس پرانی اس روح کے قول کے مطابق وہ جوتیما ہے،تو اپنی محبوبہ نینی کے سوا دنیا و مافیہا کو بھول جاتا۔رات بھیگتی جارہی تھی اور سناٹا گہرا ہوتا جارہا تھا کہ اچانک اس کے کان بج اٹھے۔کھڑکی آج بھی کھلی تھی اور بہت دور ایلورا کے ان ویران کھنڈروں کی طرف سے وہی گھنگھروؤں کی مدھم مدھم جھنکار اسے سنائی دے رہی تھی۔وہ چونک پڑا۔اور پھر اس جھنکار کی سحر انگیز گونج کے ساتھ ڈاکٹر مدن سوتا گیا اور جاگتا گیا۔غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں اور اس نے دیکھا۔وہ باہر کھڑی ہے۔وہ اٹھ کھڑا ہوا،اسی عالم میں،شب خوابی کے اسی لباس میں۔کھڑکی اونچی نہ تھی،اس لیے اس کے ذریعے باہر جاتے وقت کوئی آواز بھی نہ ہوئی۔وہ پلٹ کر ان کھنڈروں کی طرف چلنے لگی اور وہ اس کے پیچھے۔

''نینی۔''اس نے پکارا۔اور اس کا جواب اسے اپنے کان میں سرگوشی کرتا ہوا ملا۔

''چلے آؤ۔''

وہ اس کے پیچھے چلتا رہا۔اس اندھیرے میں،ٹھوکر کھاتا،سنبھلتا۔بالآخر وہ اس کھنڈر کے قریب پہنچ کر رک گیا،جہاں کل رات وہ اسے ملی تھی۔

وہ اندر داخل ہوگئی اور ڈاکٹر مدن بھی۔یہاں کافوری شمعیں روشن تھیں اور ایک عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔اندر داخل ہونے پر وہ اسے پتھر کے ایک چبوترے پر بیٹھی ہوئی ملی۔

''نینی۔''وہ اسے پکارتا ہوا اس کی طرف بڑھا،مگر چبوترے سے ٹکرا کر لڑھک گیا۔ وہ وہیں موجود تھی،مگر وہ اسے چھو نہ سکا۔

''جوتیما۔'' اسے اس کی آواز سنائی دی۔ ''کیا مجھے ابھی اور انتظار کرنا پڑے گا؟''

''کس کا؟'' ڈاکٹر نے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آنکھیں اس وقت بے نور سی ہو رہی تھیں۔

''تمہارا۔ میں ڈھائی ہزار برس سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں اور اگر میرا وہ مجسمہ جس کے ساتھ میری زندگی کی ادھوری تمنا تم سے وابستہ قائم کیے ہوئے تھی، اب بھی تمہارے ہاتھوں تک نہ پہنچتا تو نہ جانے کب تک میں تمہاری تلاش میں بھٹکتی رہتی۔''

''تم میرے قریب کیوں نہیں آتی؟'' مدن نے کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اسے خود اپنی آواز بہت دور سے آتی معلوم ہوئی۔

''میں تم سے بہت دور ہوں، ہزاروں سال دور، مگر تم چاہو تو ایک پل میں میرے پاس پہنچ سکتے ہو۔''

''مجھے بتاؤ، نینی، یہ دوری خود مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ میں خود بہت بے چین ہوں۔''

''صرف اسی جگہ ہمارا ابدی ملاپ ہو سکتا ہے۔ صرف اسی مقام پر، جہاں تم نے میرے لیے اپنا سر کٹایا تھا۔''

''تو میں کیا کروں، بتاؤ نا مجھے؟ تمہارے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''

اسے جواب ملا۔

''اس ستون کو پوری طاقت سے دھکیلو، یہ چھت تم پر گر پڑے گی۔'' اس نے جواب دیا۔ اور اس کے سنتے ہی از خود رفتگی کے انداز میں وہ ستون کی طرف بڑھا، جس پر اس کھنڈر کی چھت ٹکی ہوئی تھی۔

اس نے ستون کو تھاما ہی تھا کہ ایک آواز نے اسے روک دیا۔

کہیں دور کوئی چیخ رہا تھا۔ ''ڈاکٹر مدن۔ تم کہاں ہو، مدن؟'' وہ کرن کی چیخیں

تھیں۔کیونکہ اندھیری رات میں کھنڈر کا راستہ پالینا یا یہاں تک پہنچ جانا آسان نہ تھا۔

دوسری بار اس آواز کو سن کر اس کے ہاتھ وہیں رہ گئے۔

''تم میرے ہو، جوتیا۔تمہیں دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے نہیں چھین سکتی۔میں نے ڈھائی ہزار برس تمہارا انتظار کیا ہے۔میں صدیوں کی سیمائیں پار کر کے تمہیں لینے آئی ہوں۔''

اسے غنی کی آواز سے پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔اور وہ تذبذب کے عالم میں بت بنا کھڑا رہ گیا۔مگر وہ گھنگھرو پھر چھنک اٹھے۔وہ رقص کرنے لگی۔وہی والہانہ رقص جس میں سحر بھی تھا،موسیقی بھی اور آسیب بھی۔گھنگھروؤں کی جھنکار میں کرن کی پکار دب گئی۔مدن کے کان اسے نہ سن سکے اور وہ ناچتی رہی۔

''میرے قریب آؤ، جوتیا۔دیکھو، میں کتنی بے چین ہوں تمہارے لیے۔دھکیل دو اس ستون کو۔میرے اور تمہارے درمیان یہی ایک رکاوٹ ہے۔آجاؤ، میرے دیوتا۔تم میرے تھے اور میرے ہی رہو گے۔تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔کسی کی تقدیر بھی بھی۔''

وہ کہتی رہی اور ناچتی رہی اور مدن کے ہاتھ اس ستون پر پیوست ہوتے گئے۔

گھنگھروؤں کی جھنکار اور تیز ہوتی گئی اور وہ کرن کے دکھی دل کی پکار نہ سن سکا۔

ستون دیکھنے میں کافی مضبوط معلوم ہوتا تھا،لیکن صدیوں سے اسی طرح چھت کا بوجھ سنبھالے سنبھالے اس کے جوڑ بھی کمزور ہو چکے تھے اور پھر اسے منہدم ہو جانے والے دوسرے ستونوں کا بوجھ بھی اکیلے سنبھالنا پڑ رہا تھا۔

''جوتیا... بہادر اور جانثار، جوتیا...کیا تم میرے لیے اس ستون کو بھی نہیں گرا سکو گے؟''

اور آدھی رات کے اس ویران اور بھیانک سکوت میں منہدم ہونے والے کسی مکان کا سا شور برپا ہو گیا۔اس کے دھڑ دھڑاہٹ نے ٹارچ لے کر بھٹکتی ہوئی کرن کو چونکا دیا۔ڈاکٹر دوبے اور جمشید جی اور ان کے پیچھے مرزا اور چوبے جی بھی آپہنچے تھے۔

مگر رات کے وقت کھنڈروں اور غاروں کے اس شہر میں انھیں تازہ تازہ منہدم ہونے والے اس کھنڈر کا پتا نہ چل سکا۔

وہ صرف اتنا ہی سن سکے تھے کہ کہیں کوئی چھت یا دیوار گری ہے، مگر کہاں؟ یہ نہ معلوم ہو سکا اور نہ ہی انھیں رات میں اس کھنڈر کا راستہ ملا جہاں سے وہ کل صبح ڈاکٹر مدن کو اٹھا کر لائے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

سحر کا نور پھیلتے ہی وہ سب کے سب ہی ان کھنڈروں کی طرف دوڑ پڑے۔ سب سے پہلے دوڑتی ہوئی کرن ہی وہاں پہنچی۔ اور انھیں ڈاکٹر مدن مل گیا۔ مگر بڑے بڑے جوڑ دار پتھروں کے ڈھیر تلے دبا ہوا۔ اس کے سر سے بہا ہوا خون پتھروں پر ہی جم گیا تھا۔ ایک لافانی محبت کی ڈھائی ہزار سال پرانی داستان جو ایلورا کے آباد شہر سے شروع ہوئی تھی، ڈھائی ہزار سال کے بعد اسی مقام پر، اسی کھنڈر میں ختم ہو گئی، جہاں ایک محبت کرنے والے نے دوبارہ اپنے محبوب کے لیے جان دی تھی۔ پہلی بار جوتیما کی حیثیت سے اور دوسری بار مدن کی شکل میں۔

وہ اسی دن ایلورا سے واپس چل دیے۔ سب کے ہی دل ڈاکٹر مدن کی اس غیر متوقع پراسرار اور اچانک موت سے بوجھل ہو رہے تھے، مگر سوائے کرن کے سب کا یہی خیال تھا کہ ڈاکٹر کا دماغ خراب ہو چکا تھا۔ اور اگر اس کی موت واقع نہ ہو جاتی تو اس کا انجام اور دردناک ہوتا۔

البتہ کرن جو اس غار میں رقص کرتے ہوئے گھنگھروؤں کی وہ پراسرار جھنکار سن چکی تھی، جانتی تھی کہ ڈاکٹر کا دماغ نہیں خراب ہوا تھا۔ وہ یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی کہ اس کی موت اتفاقاً واقع ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ کسی آسیب نے ہی اس کی جان لی ہے۔

Akram Allahabadi

اور جب تیسرے چوتھے دن پروین نے ڈاکٹر کا چھوٹا سوٹ کیس کھولا تو وہ سب ہی حیران رہ گئے۔اس میں کرن کے نام ایک چھوٹا سا خط رکھا تھا، جس میں لکھا تھا:

میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے اور تم بچپن سے ہی میرا انتظار کر رہی ہو، لیکن کوئی اور بھی ہے جو ڈھائی ہزار سالوں سے میرا انتظار کر رہا ہے۔

شاید مجھے اس سے پاس جانا پڑے۔ کیونکہ اس کا حق زیادہ ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں وہی ہوں جس کے لیے وہ آئی ہے۔شاید تمہارا حق چکانے کے لیے میں کسی اگلے جنم میں تم سے مل سکوں، مگر میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ میری روح اس کے لیے تڑپ رہی ہے۔

فقط

مدن

جو تمہارا نہ ہو سکا

یہ خط کسی کی سمجھ میں نہیں آیا، مگر کرن نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ لیا اور سسکیاں لے کر رونے لگی۔

☆☆☆ ختم شد ☆☆☆

Akram Allahabadi